اشاعت کا ۹۶واں سال

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

ستمبر ۲۰۱۸ء

۱۵؍روپے

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

اردو کے مایۂ ناز ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ پیدائش (ستمبر)

فانی بدایونی

کلیم الدین احمد

ممتاز شیریں

شمینہ راجہ

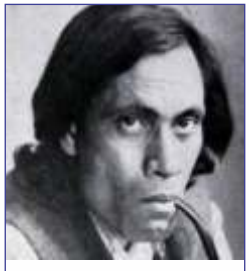
صابر دت

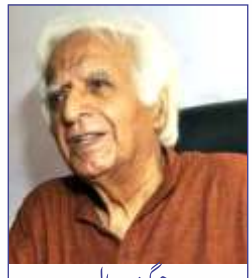
جوگیندر پال

راجیندر سنگھ بیدی

پرویز شاہدی

بلراج کومل

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

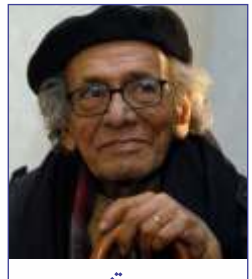
حبیب تنویر

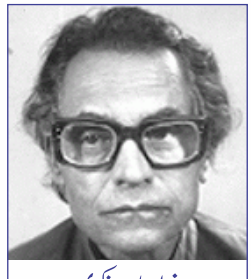
خمار بارہ بنکوی

نوح ناروی

آل احمد سرور

رئیس امروہوی

راجیندر سنگھ بیدی	یکم ستمبر ۱۹۱۵ء	۱۱ر نومبر ۱۹۸۴ء
حبیب تنویر	یکم ستمبر ۱۹۲۳ء	۸ر جون ۲۰۰۹ء
فاطمہ ثریا بجیا	یکم ستمبر ۱۹۳۰ء	۱۰ر فروری ۲۰۱۶ء
سید عبدالعظیم	یکم ستمبر ۱۹۳۰ء	۱۱ر جنوری ۲۰۱۶ء
منشایاد	۵ر ستمبر ۱۹۳۷ء	۱۵ر اکتوبر ۲۰۱۱ء
جوگیندر پال	۵ر ستمبر ۱۹۳۷ء	۲۳ر اپریل ۲۰۱۶ء
آل احمد سرور	۹ر ستمبر ۱۹۱۱ء	۹ر فروری ۲۰۰۲ء
صابر دت	۹ر ستمبر ۱۹۳۸ء	۳ر فروری ۱۹۹۹ء
رضوان احمد	۹ر ستمبر ۱۹۴۷ء	یکم جون ۲۰۱۱ء
شمینہ راجہ	۱۱ر ستمبر ۱۹۶۱ء	۳۰ر اکتوبر ۲۰۱۲ء

ممتاز مفتی	۱۲ر ستمبر ۱۹۰۵ء	۳ر نومبر ۱۹۹۵ء
رئیس امروہوی	۱۲ر ستمبر ۱۹۱۴ء	۲۲ر ستمبر ۱۹۸۸ء
ممتاز شیریں	۱۲ر ستمبر ۱۹۲۴ء	۱۱ر مارچ ۱۹۷۳ء
فانی بدایونی	۱۳ر ستمبر ۱۸۷۹ء	۲۶ر اگست ۱۹۴۱ء
کلیم الدین احمد	۱۵ر ستمبر ۱۹۰۸ء	۲۲ر دسمبر ۱۹۸۳ء
شان الحق حقی	۱۵ر ستمبر ۱۹۱۷ء	۱۱ر اکتوبر ۲۰۰۵ء
رام لال نابھوی	۱۶ر ستمبر ۱۹۱۸ء	۱۶ر مارچ ۱۹۹۵ء
عطا کاکوروی	۱۷ر ستمبر ۱۹۰۴ء	۲۳ر فروری ۲۰۱۶ء
نوح ناروی	۱۸ر ستمبر ۱۸۷۸ء	۱۰ر اکتوبر ۱۹۶۲ء
یوسف حسین خاں	۱۸ر ستمبر ۱۹۰۲ء	۲۱ر فروری ۱۹۷۹ء

خمار بارہ بنکوی	۱۹ر ستمبر ۱۹۱۹ء	۱۹ر فروری ۱۹۹۹ء
عرش ملسیانی	۲۰ر ستمبر ۱۹۰۸ء	۲۵ر ستمبر ۱۹۷۹ء
مانک ٹالہ	۲۱ر ستمبر ۱۹۲۴ء	۱۹ر فروری ۲۰۱۳ء
محمد حسنین بیکل	۲۳ر ستمبر ۱۹۲۳ء	۱۷ر فروری ۲۰۱۶ء
منظر کاظمی	۲۴ر ستمبر ۱۹۴۰ء	۱۲ر اگست ۲۰۰۰ء
برج پریمی	۲۴ر ستمبر ۱۹۳۸ء	۳۰ر اپریل ۱۹۹۰ء
شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۲۴ر ستمبر ۱۹۳۰ء	۱۵ر ستمبر ۱۹۹۳ء
اطہر پرویز	۲۵ر ستمبر ۱۹۲۵ء	۱۰ر مارچ ۱۹۸۴ء
بلراج کومل	۲۵ر ستمبر ۱۹۲۸ء	۲۴ر نومبر ۲۰۱۳ء
رام بابو سکسینہ	۲۷ر ستمبر ۱۸۹۶ء	۲۰ر دسمبر ۱۹۵۷ء
پرویز شاہدی	۳۰ر ستمبر ۱۹۱۰ء	۵ر مئی ۱۹۶۸ء

بشکریہ 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'

جلد : ۷۳ شمارہ : ۵

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

ستمبر ۲۰۱۸ء

پبلشر: ڈاکٹر اجوّل کمار
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹر
سہیل وحید

فون: 9415007694
Ph. No. 2239132 Ext. 228
Email: nayadaurmonthly@gmail.com

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِسالانہ
صبا عرفی
فون: 7705800953

تزئین کار : وقار حسین

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ
شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش
زرِسالانہ : ۱۶۵ روپے

ترسیل زر کا پتہ
ڈائرکٹر
انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط وکتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
۶ پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

اداریہ — الوداع نیا دور ۲

مجتبیٰ حسین سے ایک ملاقات — عجز وانکسار کا پیکر مجتبیٰ حسین ۵

مجتبیٰ حسین: اپنی تحریروں میں

۱ اپنی یاد میں ۱۵
۲ غزل سپلائنگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی ۲۰
۳ مشاعرے اور مجرے کا فرق ۲۳
۴ دیمکوں کی ملکہ سے ایک ملاقات ۲۶
۵ خوشونت سنگھ کی یاد میں ۲۹
۶ اردو کا آخری قاری ۳۴

مجتبیٰ حسین کے رول ماڈل — قسط ..... مارک ٹوئن ۳۸

مجتبیٰ حسین: دوسروں کی تحریروں میں

شمیم حنفی

آدمی نامہ ایک جائزہ
صفحہ ۴۰

مولانا آغا روحی

جاپان چلو میری نظر میں
صفحہ ۴۳

فیاض رفعت

مجتبیٰ حسین کی بے مثال فنکاری
صفحہ ۴۶

بیگ احساس

مجتبیٰ حسین
صفحہ ۵۴

صبیحہ انور

ندیم دوست
ص ۵۷

معصوم مرادآبادی

مجتبیٰ حسین کے ساتھ ایک شام
ص ۶۰

گل رعنا

مجتبیٰ حسین اور ہمعصر مزاح نگاروں میں مماثلت
ص ۶۲

محسن خان

مجتبیٰ حسین اور حیدرآباد
صفحہ ۶۶

رفیق احمد

اردو طنز ومزاح کے میر کارواں مجتبیٰ حسین
صفحہ ۶۹

صابر علی سیوانی

مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور ادبی خدمات
صفحہ ۷۳

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

الوداع نیا دور

ہندوستان کے مایۂ ناز میڈیا گھرانوں کے ہندی اردو اخباروں میں دوران ملازمت بڑی بڑی شخصیات سے ملاقات اور ان سے انٹرویو کرنے کا شرف ہمیں حاصل رہا ہے۔ یورپ کے کچھ ممالک میں بطور صحافی کئی عالمی شخصیتوں سے گفتگو کا موقع بھی حاصل ہوا۔ ایک اخبار نویس کے طور پر یہ کوئی معرکہ سر کرنے کی بات نہیں ہے۔ اس سے پہلے دہلی یونیورسٹی سے تحقیق کا مرحلہ طے کرتے ہوئے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تقریب میں عصمت چغتائی، مجروح سلطانپوری، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، اصغر علی انجینئر سمیت دوسرے تمام ادباء و شعراء سے ملاقات اور گفتگو بھی راقم الحروف کے حصے آئی۔ دراں اثنا عالمی اردو کانفرنس کے دوران حبیب جالب، قتیل شفائی، کشور ناہید، کیف بھوپالی سمیت کئی بڑے صحافیوں وغیرہ سے ملنے جلنے اور بات چیت کے مواقع بھی حاصل ہوئے۔ گیان پیٹھ اوارڈ ملنے پر قرۃ العین حیدر اور سرسوتی سمان ملنے پر نیر مسعود کا انٹرویو کرنے کا موقع بھی ہاتھ آیا۔ اپنی ادبی اور صحافتی زندگی کے ان تجربوں کے مدنظر ہمیں یہ بالکل منظور نہیں تھا کہ عصری طنز و مزاح کے شہنشاہ مجتبیٰ حسین صاحب پر شمارہ تیار کرنے کی جرأت ان سے ملاقات کئے بغیر کی جائے۔ چنانچہ ہم نے ذاتی طور پر حیدرآباد کی مسافت طے کی اور تین چار روز ان کے پاس بیٹھ کر، ان سے مل کر، ان سے خوب باتیں کیں۔

دو تین دہائیوں پر مشمول اپنی صحافتی زندگی میں سیکڑوں شخصیات سے ہوئی بات چیت، ذہن کے دریچوں سے رخصت ہو چکی ہے۔ وہ لوگ جن کے قد بہت بڑے تھے اور وہ لوگ جن کا شمار مشاہیر میں نہیں ہوتا تھا، ان میں سے بہت کم لوگوں کی ملاقات کے تاثرات قائم ہیں۔ نامور لوگوں سے متاثر ہونے کا عمل ہم نے اپنے اندر ذرا کم ہی پایا ہے۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ جب مجتبیٰ حسین صاحب سے ملاقات ہوئی تو تمام بڑے لوگوں میں سے کئی ان کے آگے اتنے بڑے نہیں رہ گئے جتنے وہ پہلے ہوا کرتے تھے۔ مجتبیٰ حسین کے اندر ایک بہت زبردست قسم کا جو عجز و انکسار موجود ہے وہ دوسری شخصیات کے یہاں شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے۔ ان کے اندر جو خلوص ہے، وہ اس درجہ بلند مرتبہ لوگوں میں شاید ہی کہیں موجود ہو۔ مجتبیٰ حسین ابھی بھی چھوٹوں سے، بڑوں سے، بزرگوں سے، بچوں سے، پڑھے لکھوں سے اور بے پڑھوں سے غریب سے، امیر سے، مدیر سے یا ادیب سے بالکل ویسے ہی ملتے ہیں جیسے اب سے پچیس سال قبل ملتے تھے۔ کسی بھی قسم کا تصنع اور زعم ان کی شخصیت کا ذرا سا بھی حصہ نہیں بن سکا۔ وہ سرتا پا عجز و انکسار کا پیکر ہیں۔ اردو کیا ہندوستان کی کسی دوسری زبان کے کسی بھی بڑے سے بے ادیب و شاعر کے یہاں یہ وصف اس قدر موجود نہیں ہے۔ مجتبیٰ حسین سے فون پر بات کرنے والا شخص بھی ان کا گرویدہ اسی لئے ہو جاتا ہے۔

نیا دور فیس بک اور واٹس اپ پر بھی

نیا دور کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا حال فیس بک اور واٹس اپ پر قارئین کے مطالعہ کے لئے پوسٹ کئے جا رہے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے فن مزاح کے بارے میں بات کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے اور ویسے بھی مجتبیٰ حسین کی تحریریں پڑھنے اور محظوظ ہونے کے لئے ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ان پر کسی قسم کی تنقید برداشت ہی نہیں ہوتی۔ ان تحریروں کے بارے میں ایک بات اور کہ مجتبیٰ حسین کی تحریریں آج کے دور کے پروردہ امراض کا علاج بھی ہیں مثلاً اختلاج ہو یا احساس تنہائی، احساس برتری ہو یا کمتری یا پھر زمانے سے ہارتے ہارتے خود شکستگی کا احساس۔ ان

جون ۲۰۱۸ء سے 'نیا دور' کی قیمت ۱۵/روپئے فی شمارہ متعین کرنے کے ساتھ زرِ سالانہ ۱۶۵/روپئے طے کیا گیا ہے

تحریروں کو پڑھ لیجئے تو کم از کم کسی ڈاکٹری نسخے کی ضرورت فوری طور پر تو نہیں پڑے گی۔ جیسے جیسے مشین اور موٹر انسانی اعضاء کو اپنی تحویل میں لیتے جا رہے ہیں ویسے ویسے جسم کو نئی نئی بیماریاں گھیرنے لگی ہیں کہ مشین اور موٹر کے عمل دخل کے تناسب میں فنون لطیفہ اور ادب کے ذریعہ ہونے والی تطہیر سے ہم دور ہوتے جا رہے ہیں۔ دور حاضر کا یہ وہ المیہ ہے جس پر لوگ سر تو دھنتے ہیں لیکن اپنے اردگرد کے فنکاروں کو جو اہمیت دینی چاہئے، اس بارے میں نہیں سوچتے ہیں۔

ہمیں اس بات کا اطمینان ضرور ہے کہ ہم نے چلتے چلتے اپنی ادارت کا آخری شمارہ دور حاضر کے طنز و مزاح کے شہنشاہ مجتبیٰ حسین کے نام معنون کرنے میں جیسے تیسے کامیابی حاصل کر ہی لی۔ جیسا کہ اداریہ کی ابتدا میں عرض کیا ہے، مجتبیٰ صاحب جتنے بڑے فنکار ہیں، اس سے بڑے انسان ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ شمارہ دفتری الجھنوں کی نذر ہو گیا اور بڑی بے دلی سے ہم اسے مرتب کر پائے۔ جن حالات میں اسے تیار کیا گیا ہے، ان حالات میں عام رسالہ نکالنا بھی مشکل ہوتا ہے لیکن ساتھی وقار حسین رضوی نے اس مشکل گھڑی میں ہمیں بہت سہارا دیا اور ان کی محنت سے بالآخر مجتبیٰ صاحب پر مرکوز یہ شمارہ نکھر کر سامنے آ ہی گیا۔

بحیثیت مدیر 'نیا دور' گزشتہ تقریباً ڈیڑھ سال کا یہ عرصہ ہمارے لئے کئی معنوں میں بیحد خوشگوار لیکن کچھ تلخیوں سے بھی بھرا رہا، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہی ہے۔ اس سب کے لئے کسی کو بھی موردِ الزام ٹھہرانا نامناسب ہوگا کہ یہ بھی مکروہات دنیا کا لازمی حصہ ہے۔ 'نیا دور' کی ڈیڑھ سالہ ادارت نے ہمیں اردو دنیا کے ان رموز و اسرار سے دوبارہ روشناس کرانے کا موقع بھی فراہم کیا جن سے گزشتہ ڈیڑھ دہائی سے ہمارا رشتہ ناطہ ٹوٹ چکا تھا۔ ساتھ ہی ہم اپنے محکمۂ اطلاعات کے بھی ممنون ہیں کہ ہمیں 'نیا دور' کی ادارت کا موقع فراہم کیا۔ ہم ان تمام قلمکاروں کے بیحد ممنون ہیں جنہوں نے گزشتہ ڈیڑھ برس میں ہماری ایماء پر 'نیا دور' میں لکھنا منظور کیا بلکہ 'نیا دور' سے جذباتی طور سے وابستہ ہو گئے۔ ادارۂ 'نیا دور' کے تمام رفقائے کار کا بھی شکریہ کہ انہوں نے ہمیں ہمہ وقت تعاون کیا۔ ان تمام لوگوں کا بھی شکریہ جنہوں نے ہماری خواہش کے مطابق 'نیا دور' کے لئے اپنے اپنے تئیں کارہائے نمایاں انجام دئے۔ ان تمام لوگوں کا بھی شکریہ جنہوں نے گزشتہ ڈیڑھ سال میں 'نیا دور' کی ممبرشپ اختیار کی اور ان کا بھی شکریہ جنہوں نے ممبرشپ کی تجدید کرائی۔

آخر میں صرف اتنا ہی کہ کوئی بھی ادارہ کسی بھی شخص سے بڑا ہوتا ہے اور اداروں کو قائم رکھ کر ہی اپنی زبان، تہذیب و تمدن اور ثقافت و روایت کی میراث کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ کسی کے آنے جانے سے کسی ادارہ پر کوئی فرق نہیں پڑنا چاہئے کہ آنے اور جانے کے اس عمل میں غالب نے کتنی زبردست ندرت پیدا کر دی ہے۔

وداع و وصل جداگانہ لذتی دارد

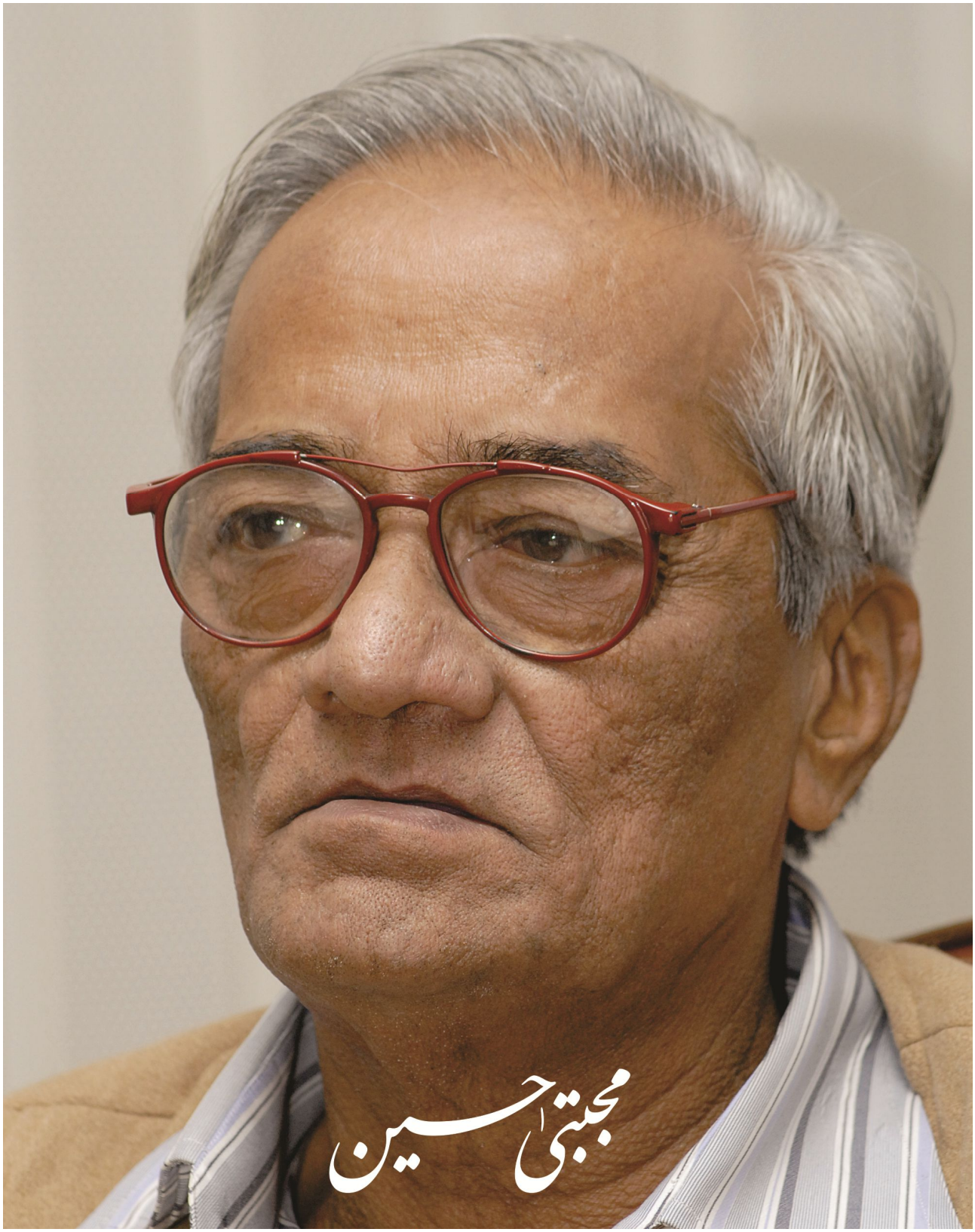
مجتبیٰ حسین

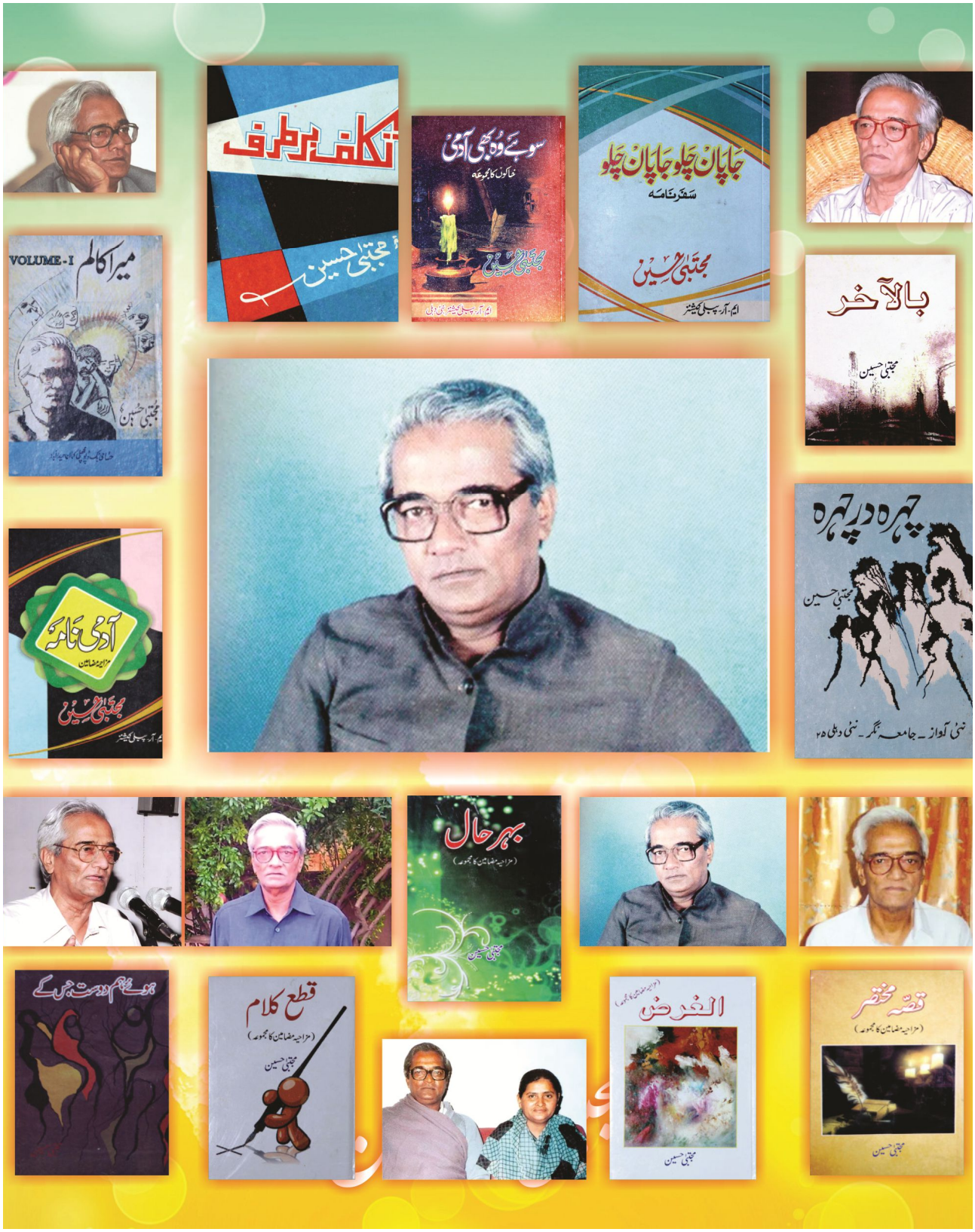

تکلف برطرف
مجتبیٰ حسین
سو ہے وہ بھی آدمی
خاکوں کا مجموعہ
مجتبیٰ حسین
جاپان چلو جاپان چلو
سفرنامہ
مجتبیٰ حسین
ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز
میرا کالم
VOLUME - I
مجتبیٰ حسین
بالآخر
مجتبیٰ حسین
چہرہ در چہرہ
مجتبیٰ حسین
نئی آواز۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
آدمی نامہ
مزاحیہ مضامین
مجتبیٰ حسین
ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز
بہر حال
(مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)
مجتبیٰ حسین
ہوئے ہم دوست جس کے
قطع کلام
(مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)
مجتبیٰ حسین
الغرض
(مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)
مجتبیٰ حسین
قصہ مختصر
(مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)
مجتبیٰ حسین

عجز و انکسار کا پیکر

مجتبیٰ حسین

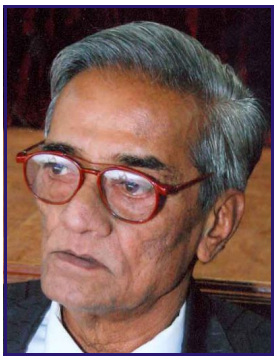

مجتبیٰ حسین

پندرہ اگست کو صبح ۵ ربجے حیدرآباد کے راجیو گاندھی انٹرنیشنل ایرپورٹ سے باہر نکلے تو خوشگوار ہواؤں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا۔ ہماری اولا نے چلنا شروع کیا اور چند منٹوں میں ہی اس نے اس سڑک پر رفتار پکڑلی جو شمس آباد سے ہمیں مہدی پٹنم تک لے جاتی ہے۔اولا ہمیں ہندوستان کے سب سے طویل ۱۲ رکلومیٹر والے فلائی اوور کی سمت لے جارہی تھی جس پر سے اترنے کے کچھ ہی دور پر مساب ٹینک علاقہ میں ہمارا ہوٹل واقع تھا۔

ایرپورٹ سے فلائی اوور تک کا راستہ بیحد خوبصورت تھا۔دونوں جانب ہریالی اور ڈوائڈر پر سلیقے سے لگے گول چوڑے ہرے تنے والے بڑے بڑے چار پانچ پتوں والے پام کے درخت۔ان پیڑوں کو جب بھی ہم دیکھتے ہیں تو آر کے اسٹوڈیو کے لوگوں کی یاد آجاتی ہے جس میں ہیرو کا ہاتھ ہیروئن کی کمر پر ہے اور ہیروئن نے اس ہاتھ پر ہی اپنی کمر کے اوپری حصے کو پیٹھ کے بل دوہرا کر لٹکا سا دیا ہے۔پام کے پتوں کی اس ادا میں راج کپور نے عشق کو پنہاں کر دیا ہے۔

ہندوستان کے سب سے طویل فلائی اوور عبور کرنے میں بہت کم وقت لگا کیونکہ ڈرائیور نے خاصی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا تھا۔اتنی تیز کہ کئی بار مجھے اسے ٹوکنا بھی پڑا تھا۔لیکن اس نے نہیں سنا۔بہرکیف ہوٹل گول کنڈہ آ گیا۔شاندار اسٹار ہوٹل۔کچھ ہی وقفہ میں ہم لوگ اپنے کمرے میں تھے جس کی سڑکوں کی طرف والی دیوار شیشے کی تھی۔عمدہ نظارہ، فلائی اوور پر رواں دواں ٹریفک اور بادلوں سے ڈھکا آسمان۔آرام دہ بستر پاتے ہی جسم کی تھکان سے سیدھے نیند کی آغوش میں پہنچ گیا جہاں سولہویں صدی کی قطب شاہی ریاست، قلی قطب شاہ کی بارہ پیاریوں اور گولکنڈہ قلعہ کے بنتے بگڑتے نقوش خواب میں میرا انتظار کر رہے تھے۔

دو تین گھنٹے کے بعد آنکھ کھلی، شیشہ کی دیوار سے پردہ ہٹایا۔سامنے ٹریفک اور آسمان میں بادل دونوں موجود تھے۔موسم اس قدر خوشگوار کہ اس کیفیت کی خنکی بھرے احساس کو شیشے کے اس طرف بھی محسوس کیا جاسکتا تھا۔کچھ کچھ وقفہ سے بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہوٹل سے باہر نکلا اور چار مینار کا رخ کیا کہ روایتی طور پر حیدرآباد کی پہلی زیارت چار مینار ہی کی ہوتی آئی ہے۔باہر نکلا تو یکسر خیال آیا کہ پہلے ہمیں مجتبیٰ صاحب سے ملنا چاہئے کیونکہ حیدرآباد آمد کا اصل مقصد تو مجتبیٰ صاحب سے ملاقات ہی ہے۔

اولا کینسل کی۔ مجتبیٰ حسین صاحب کو فون کیا۔ امنگوں بھری ان کی توانا آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ لکھنؤ سے فون پر بات کرتے ہوئے ان کی آواز میں جو ہمہمہ اور تمتما محسوس ہوتا تھا وہ کافی تھا لیکن حیدرآباد میں ہونے پر ان کی آواز کی جولانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے بلا تاخیر ان کے رہائشی اپارٹمنٹ کی جانب رخ کیا جو ہوٹل سے تھوڑی سی مسافت پر واقع تھا۔ ان کے اپارٹمنٹ کی پارکنگ میں پہنچے تو دیکھا کہ مجتبیٰ صاحب اپنی 'ماروتی ۸۰۰' کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر اترنا چاہا لیکن میں نے انہیں بصد احترام روکا اور پھر سلام دعا کے بعد ان کا دست شفقت میرے سر پر تھا۔

مجتبیٰ صاحب سے ملاقات کے سلسلہ میں انہوں نے خود ہی کہا تھا کہ فون پر بھی انٹرویو ہو سکتا ہے لیکن فیصلہ میرا خود کا تھا کہ ہندوستان کے اس عظیم شہنشاہِ طنز و مزاح سے طویل ملاقات کے بنا ان پر کچھ بھی لکھنا یا کچھ کام کرنا فن طنز و مزاح کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

ایک ساعت بھی نہیں گزری تھی کہ باتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ انہوں نے بتایا کہ شام کو آدھے گھنٹے کے لئے ٹہلنے ضرور نکلتے ہیں۔ اس کار سے بھی ادھر ادھر آتے جاتے ہیں۔ اسی بہانے ذرا سیر بھی ہو جاتی ہے اور یہی علاج بھی ہے اس بڑھاپے کی بیماری کا اور آج سے ٹھیک ایک مہینہ قبل ۱۵ر جولائی کو ۸۶ ویں سال میں داخل ہو گیا ہوں۔ اب اس عمر میں اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ پھر بولے کہ ہمارا بڑھاپا شباب کو پہنچ چکا ہے، آدمی کو اتنا بوڑھا بھی نہیں ہونا چاہئے۔ طے ہوا کہ چار مینار گھوم آنا چاہئے۔ آج تعطیل ہے۔ بھیڑ کم ہوگی۔ مجتبیٰ صاحب نے اپنے ایک شاگرد محسن خان کو میرے ساتھ کر دیا اور ہم پہنچ گئے چار مینار۔

سترہ برس قبل جب رامو جی راؤ نے اردو ای ٹی وی لانچ کیا تھا، تب راقم السطور کا حیدرآباد میں کئی دن قیام رہا تھا۔ چار مینار کا علاقہ اس وقت اتنا گنجلک نہیں تھا جتنا اس مرتبہ۔ ہر طرف بھیڑ ہی بھیڑ اور خومچے والوں کو اپنا سب کچھ فروخت کر دینے کی عجلت۔ اس قدر کنجیشن پیدا کر دیا گیا ہے یا ہو گیا ہے کہ سرتاپا چار مینار کا فوٹو بھی لینا محال ہو چکا ہے۔

مکہ مسجد کی تعمیر نو ہو رہی ہے۔ پہلے کہیں سکیورٹی نہیں تھی لیکن اب مسجد میں داخلہ کے لئے میٹل ڈٹکٹر سے گزرنا پڑتا ہے۔ سخت چوکسی ہے۔ ابھی ابھی تھوڑی سی بارش ہوئی ہے اور ہر طرف پانی کیچڑ لئے بہہ رہا ہے۔ سترہ سال پہلے چار مینار کو رنگین لائٹس سے جگمگ کرنے کا انتظام نہیں تھا۔ اس بار یہ اضافہ تھا۔ برابر والے لاڈ و بازار کی دکانوں نے بھی خاصی ترقی کر لی تھی۔ اس بازار کی انفرادیت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ جدیدیت نے اس کی روایتی وراثت کو ختم جیسا کر دیا تھا۔ لیکن حیدرآباد میں جو چیز باقی تھی وہ تھا یہاں کا لب ولہجہ، ہر طرف وہی جملے اور وہی زبان آج بھی قائم تھی جسے دکن کا امتیاز کہا جاتا ہے حالانکہ یہ وہی لہجہ تھا جس کا ہزلیہ بالی ووڈ کی فلموں میں معروف اداکار محمود نے بخوبی پیش کیا ہے۔

چار مینار سے واپسی کے وقت محسن خان نے مدینہ مارکیٹ کے بارے میں بتایا کہ جب عرب میں تیل نہیں نکلا تھا اور وہاں غریبی تھی تو نظام نے مدینہ مارکیٹ بنوایا جس میں سیکڑوں ملگیاں (دکانیں) ہیں جن کا کرایہ عرب بھیجتے تھے نظام ان لوگوں کی مالی مدد کے لئے۔ اور یہ ہے اردو مسکن تیلانگنا اردو اکادمی کا آڈیٹوریم جس میں جلسے وغیرہ منعقد ہوتے ہیں اور لائبریری بھی موجود ہے اور یہ رہا نظام کا چومہلا پیلیس۔ 'یہ نظام کا حرم تھا کیا؟' میں نے برجستہ پوچھا۔

ہمارے اس سوال کے جواب میں محسن کے چہرے پر محمود اسٹائل کی خجالت تیر گئی اور انہوں نے اس بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ بھیڑ بھرے راستے سے گزرتے وقت اچھا خاصا وقت لگ گیا۔ بالآخر ہم لوگ آٹھ بجے کے قریب حسین ساگر جھیل کے پاس تھے۔ جھیل کے ایک کنارے پر ایک طویل قطار میں تیلگو وغیرہ کے ادیبوں اور شاعروں کے قد آدم مجسمے موجود ہیں۔ اردو میں صرف اپنے مخدوم محی الدین کا مجسمہ ہی نصب ہے۔ ان کے مجسمے کے پیڈسٹل پر تیلگو زبان میں نہیں معلوم کیا درج ہے۔ ہم نے اس پیڈسٹل کے چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھا۔ اردو کے اس عظیم انقلابی شاعر کے بارے میں اردو میں ایک لفظ بھی کندہ نہیں تھا۔

جھیل کے ساحل پر بنی سیاحی روڈ پر سیلانیوں کی بھیڑ، خومچوں سے نکل رہی طرح طرح کے لوازمات کی خوشبو اور قریب میں ہی بُھٹے سکنے کی سوندھی

سابق صدر جمہوریہ ہند جناب اے پی جے عبدالکلام سے پدم شری ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین (۲۰۰۷ء)

مہک بھی مخدوم کے مجسمہ پر اردو کی عدم موجودگی کے ملال کو کم نہ کرسکی۔

اب کسے ہے دماغ تہمت عشق
کون سنتا ہے بات پھولوں کی

چار مینار سے یہاں تک بازاروں میں لگے سائن بورڈوں وغیرہ پر اردو تحریر دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوچکی تھیں۔ حیدرآباد میں چاروں طرف اس قدر اردو دکھے گی بھی، ہمیں ایسی امید نہیں تھی لیکن مخدوم کے مجسمے کو اردو سے محروم رکھا جائے گا اس بات کا ذرا بھی اندیشہ نہیں تھا۔

حیدرآباد پہنچنے سے قبل ہی معروف افسانہ نگار شموئیل احمد نے بتایا تھا کہ پتھر گوشت ضرور کھانا، بہترین ہوتا ہے یہاں کا۔ آج کل شموئیل صاحب حیدرآباد میں اسی بارہ کلومیٹر والے فلائی اوور کے پلر نمبر ۱۷۷ کے قریب ہی ایک اپارٹمنٹ میں مقیم ہیں۔ انہیں اس دسترخوان ہوٹل میں پروفیسر بیگ احساس نے پتھر گوشت کھلایا تھا۔ ہم بھی رات میں اسی ہوٹل میں پہنچ گئے جہاں ہوٹل کے باہر ہی سل جیسے بڑے پتھر کے نیچے گیس جل رہی تھی اور پتھر پر گوشت کی بوٹیاں سینکی جارہی تھیں۔ ساتھ میں بریانی بھی کھائی لیکن اس حیدرآبادی بریانی کے ذائقہ پر ہم کوئی رائے قائم نہ کرسکے۔

اگلے دن صبح ناشتے کے بعد مجتبیٰ حسین صاحب کے گھر پہنچنا تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق وہیں پر تفصیل سے بات ہونی تھی۔ للی اپارٹمنٹ میں پہلے فلور پر ان کے گھر کے ڈرائنگ روم میں مجتبیٰ صاحب سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس عمر تک پہنچتے پہنچتے آپ کو جو شہرت، عزت اور پذیرائی حاصل ہوئی، اس پر کیسا محسوس کرتے ہیں۔

دیکھئے صاحب! ابھی پچھلے ماہ ہی ۱۵ر جولائی کو ۸۶ ویں سال میں داخل ہوا ہوں۔ بہت لمبا عرصہ گزار چکا ہوں۔ بھرپور زندگی جی چکا ہوں بس اب تو وہی شعر:

انتظار حسین کے ساتھ

اب عناصر میں اعتدال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ

پچھلی زندگی دیکھتا ہوں، احاطہ کرتا ہوں تو پاتا ہوں کہ سب کچھ ملا، موقع ملا لکھنے کا اور ۱۹۷۲ء میں دلی چلے جانے کے بعد تو زندگی کی حسرتوں کے پورا ہونے کا

مجتبیٰ حسین، شہریار کے ساتھ

دور شروع ہوگیا تھا۔ اللہ نے موقع فراہم کیا تھا۔

مجتبیٰ صاحب! بڑا گھسا پٹا سوال ہے لیکن ضروری حصہ ہوتا ہے ہر انٹرویو کا کہ کیسے لکھنا شروع کیا، تو آپ سے بھی یہ سوال حاضر ہے؟

میرے تو خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ میں ایک دن لکھوں گا لیکن لکھنے لگا اور یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ طنز و مزاح لکھوں گا۔ بچپن میں تو ہمیں ایکٹر بننے کا بھوت سوار تھا۔

ایکٹر کے طور پر اپنے آپ کو پہچنوانا چاہتا تھا۔ کالج کے ثقافتی پروگراموں میں حصہ لیتا، ہاسٹل میں پروگرام ہوتا تو وہاں بھی شامل ہوتا اور نکڑ ناٹکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تاکہ اپنے اندر کی اداکاری میں نکھار پیدا ہو سکے لیکن قدرت کو شاید یہ منظور نہیں تھا۔ تحریک آزادی کا دور دورہ تھا۔ کانگریس کے ساتھ ساتھ بائیں بازو کی جماعتیں بھی تحریک میں شامل تھیں۔ تقریباً پورے تیلنگانہ میں لفٹ تحریک بھی چھا گئی تھی۔ مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ اور روی نارائن ریڈی کے زیر اثر ایک عام سنگھرش پہلے ہی سے چل رہا تھا۔ ہم سبھی لوگ اپنے آپ کو فطری طور پر بائیں بازو سے قریب تر پاتے تھے۔ ۱۹۴۲ء تک گلبرگہ میں رہا۔ وہ بڑا پرآشوب دور تھا۔ بڑی اتھل پتھل تھی۔ فسادات بھی ہورہے تھے۔ میں اپنے ماموں کے پاس دھنچولی گیا ہوا تھا۔ وہاں فساد پھوٹ پڑے اور میں نے اپنے حقیقی ماموں کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس ہولناک منظر کا ڈر میرے اندر تک سما گیا تھا۔ ریشہ ریشہ خوف سے کانپتا تھا۔ لیکن اسکے باوجود ہم نے پڑھنا لکھنا جاری رکھا۔ اپنے غم کو اپنے اندر ہی جگہ دی اور اس غم کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیا۔ غالباً اسی لئے فطرتاً میں بہت غمگین آدمی ہوں۔ شاید اسی وجہ نے نادانستہ طور پر مجھے لاعلمی میں ہی مزاح نگار بنا دیا جب کہ مجھے اچھی طرح سے

یاد ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں ماضی کے انہیں حالات کو بھلانے کے لئے میں نے ثقافتی پروگراموں میں شرکت کرنا شروع کیا تھا۔

غم یا دکھ کیا مزاح نگاری کے لئے لازمی جز کی حیثیت رکھتا ہے جیسا کہ ابھی آپ نے اشاروں میں بیان کیا۔

اکثر مزاح نگاروں کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے اور میں اپنے بارے میں تو جانتا ہی ہوں، دنیا کے اور بھی کئی مزاح نگاروں کے لئے بھی ایسا ہی کہا جاتا ہے۔

تو مزاح نگاری کی ابتدا کیسے ہوئی؟

۱۹۵۳ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد آئے تو زندگی ہی بدل گئی۔ میں اپنے بھائیوں میں ساتویں نمبر پر تھا۔ یہاں ہمارے بڑے بھائی محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس پہلے ہی سے مقیم تھے اور گھر میں لکھنے پڑھنے کا ماحول تھا ہی۔ حالانکہ ہوش سنبھالتے ہی ادب سے وابستگی ہو گئی تھی۔ جب آنکھ کھلی تھی تو جاگیردارانہ نظام کے تحت عثمان آباد میں بھی اتنی ہی آسائشیں موجود تھیں جتنی تصور کی جاتی تھیں۔ ہمارے گھر میں میر و غالب سے لے کر کنہیا لال کپور تک کی کتابیں موجود رہتی تھیں۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے میر و غالبؔ سے لے کر نہ جانے کس کس کو پڑھ ڈالا تھا۔ حیدرآباد آئے تو ادب سے دلچسپی مزید بڑھ گئی۔ اسی دوران میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر اور ان کے دوست عابد علی خاں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر ایک اردو اخبار نکالنے کا پلان بنایا اور 'سیاست' نے جنم لیا۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں بڑی غربت تھی۔ فرقہ پرستی اور شدت پسندی بھی بڑھ گئی تھی۔ حالات ابتر تھے۔ ان حالات سے مقابلہ کرنے کے مقصد کے تحت ان لوگوں نے اخبار نکالا تھا۔ میں بھی اس اخبار سے جڑ گیا تھا اور روز شام کو جا کر وہیں کام کرتا تھا۔ اس میں شاہد صدیقی ایک مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ ان کا انتقال ہو گیا تو اچانک مجھے یہ کالم لکھنے کے لئے دے دیا گیا اور اس طرح ایک مزاح نگار نے جنم لیا۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ ۱۲/اگست ۱۹۶۲ء کو جیسے ہی میں سیاست کے دفتر میں داخل ہوا، جگر صاحب نے شاہد صدیقی صاحب کا مزاحیہ کالم لکھنے کی ہدایت دی۔ مجھ میں چوں چرا کرنے کی ہمت نہیں تھی کیونکہ میں اپنے بڑے بھائی محبوب حسین جگر کی بہت عزت کرتا تھا اور ان کی ہر بات میرے لئے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔

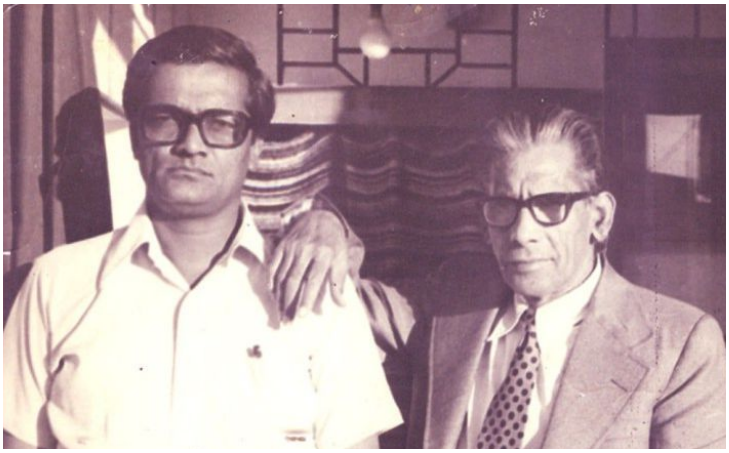

فکر تونسوی کے ساتھ

اچانک کوئی مزاح نگار یوں تو نہیں بن جاتا جیسا کہ آپ نے بتایا، کہیں نہ کہیں مزاح نگاری کے عنصر آپ کے اندر ضرور موجود رہے ہوں گے۔ کیا وہ کبھی اس کالم کو لکھنے سے پہلے عیاں ہوئے تھے؟

یہ تو کچھ زیادہ ہی تگڑا سوال کر دیا آپ نے! بات تو یہ بھی سچ ہے کہ اس کالم کو لکھنے سے پہلے مزاحیہ انداز میرے اندر پیدا ہو چکا تھا۔ اورنٹل ہوٹل جہاں تقریباً روز ہی شام کو مخدوم محی الدین سمیت تمام ادباء و شعراء جمع ہوتے تھے، وہاں میں بھی جایا کرتا تھا اور مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ میری باتوں پر لوگ اچانک ہنس دیا کرتے تھے اور ان لوگوں کے منہ سے یکسر واہ نکل جاتی تھی۔ ان میں سے کچھ کہتے بھی تھے کہ تم اچھا مزاح لکھ سکتے ہو لیکن کبھی تحریری صورت میں مزاح لکھنے کی جسارت نہیں کی تھی۔

آپ کب لکھتے ہیں، کیسے لکھتے ہیں؟ کوئی خاص وقت یا موڈ؟ ذرا تفصیل سے بتائیں؟

ارے صاحب! سب کچھ رواں دواں لکھا ہے۔ کبھی پلان نہیں کیا۔ لکھنے کے لئے، چونکہ شروعات اخبار کے کالم سے ہوئی تھی اس لئے ڈیڈ لائن پر لکھنے کی عادت شروع ہی سے پڑ گئی۔ لکھنے کے بعد اتنی فرصت کبھی نہیں ملی کہ اس کی نوک پلک درست کرنے کی نوبت آئے۔

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ اندر سے آواز آئی کہ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ مجتبیٰ صاحب کے گھر کے ڈرائنگ روم کے دائیں طرف لگے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے داہنی طرف دیوار پر اچانک میری نگاہ پڑی جہاں پر انہیں نوازے گئے پدم شری کی سند فریم کی ہوئی آویزاں تھی۔ تھوڑی دیر ہم نے اسے غور سے دیکھا۔ خاصی دھول جمع ہو چکی تھی اس پر۔ مجتبیٰ صاحب کے ساتھ ہم اندر داخل ہوئے۔ بیگم مجتبیٰ حسین نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ روایتی حیدرآبادی بریانی اور بگھرے بیگن اور خوبانی کا میٹھا۔ دسترخوان سے اٹھتی حیدرآبادی پکوانوں کی خوشبو کے درمیان مجتبیٰ صاحب کی بیگم ناصرہ اور ان کی بہو بھی گفتگو میں شامل ہو گئیں۔ مجتبیٰ صاحب کے نواسے، ان کے پوتے، بیٹے بیٹیاں، کیا کرتے ہیں، کہاں رہتے ہیں، کون ملازمت میں ہے؟ کون نوکری میں ہے، کون کتنا ذہین ہے، کون کس عہدے پر ہے وغیرہ۔ اس تفصیل کے درمیان مجتبیٰ صاحب نے اپنے ایک

نواسے کے بارے میں بتایا کہ وہ سائبر ٹیکنالوجی کا ماہر ہے اور گوگل میں کسی بڑے عہدے پر فائز ہے۔ ہم سے رہا نہ گیا، دبی زبان میں منہ سے نکل ہی گیا کہ ان لوگوں میں سے کسی نے اردو پڑھی ہے؟ جواب میں مجتبیٰ صاحب کی ہی گمبھیر آواز آئی کہ نہیں!

ظہرانہ ختم ہوا، ہاتھ دھونے کے لئے واش روم کی طرف بڑھے تو شیشے کے کواڑ والی ایک الماری پر نگاہ پڑی۔ انعامات واعزازات کی شیلڈ، اسناد اور تمغوں سے بھری ہوئی اس الماری کا حال بھی تقریباً ویسا ہی تھا جیسا بیٹھک میں لگے پدم شری ایوارڈ کے فریم کا۔ مجتبیٰ صاحب بولے، ارے یہ ہی کیا! ان کے علاوہ بھی تمام انعامات ادھر ادھر بند پڑے ہیں۔ ارے صاحب! گھر میں جگہ ہی اب کہاں ہوتی ہے۔

بیٹھک میں واپس آکر بات چیت کا سلسلہ پھر چل پڑا۔ مجتبیٰ صاحب کو ملنے والے انعامات و اعزازات وغیرہ سے بھری الماری چونکہ ذہن کے کاریڈور سے ہٹ نہیں رہی تھی اس لئے ہم نے بات چیت کا منسلک سلسلہ ایوارڈ ہی سے شروع کی۔

یوں تو آپ کسی انعام واعزاز کے محتاج نہیں لیکن پھر بھی مناسب ہوگا کہ آپ اپنے پہلے ایوارڈ کے بارے میں بتائیں۔

مجتبیٰ صاحب اس سوال پر خاصے کسمسائے، ہلکا سا پہلو بھی بدلا اور بولے:

اردو میں پہلا ایوارڈ ۱۹۸۴ء میں اس وقت کی وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی کے ہاتھوں ملا۔ لیکن صاحب! کیا عجیب مذاق ہے کہ سب سے پہلا ایوارڈ تو مجھے ۱۹۸۰ء میں اُڑیا ادب کی ایک انجمن سرس ساہتیہ سمتی نے 'ہاسیہ رتن' کے طور پر دیا تھا۔

یہ تو بڑا وضاحت طلب معاملہ ہے۔

ہاں صاحب! ہے تو لیکن کیا کیجئے۔ ایسا ہی ہوا ہے۔ میں نے لکھنا تو اردو میں ہی شروع کیا، اردو ہی میری زبان ہے اور کبھی سوچا بھی نہیں کہ کسی اور زبان میں لکھیں گے کیونکہ پروفیشن کے طور پر نہیں بلکہ عقیدہ اور مسلک کے طور پر اردو مزاح لکھا۔ یہ بھی عجب مذاق ہے کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مزاح نگار بنوں گا لیکن میرے ساتھ ایسا ہو گیا۔ اسی ہو جانے میں یہ بھی ہو گیا کہ اردو میں ہم نے جو کچھ لکھا اس سے جو ہمیں پذیرائی ملی وہ تو ملی ہی، میری تحریروں کو ہندی کے مشہور رسالے 'دھرم یُگ' میں شائع کیا جانے لگا اور وہاں سے ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ترجمہ

عطاء الحق قاسمی کے ساتھ

ہونے لگا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اُڑیا کے مشہور طنز و مزاح نگار فتورانند میرے مداح ہو گئے۔ ۱۹۸۰ء میں کٹک میں دو روزہ جشن ہوا جس میں مجھے بڑی عزت و احترام سے بلایا گیا اور اس ایوارڈ سے نوازا گیا۔ میرے لئے حیرت ناک ہے کہ اُڑیا میں میری تحریروں کے دو مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی کیا آپ کو ایوارڈ وغیرہ دئے گئے؟

تیلگو میں مضامین بہت چھپے لیکن کوئی کتاب نہیں چھپی۔ ہندی میں چھ سات کتابیں چھپیں۔ راجیندر یادو نے 'آتم درپن' میں شامل کیا اور لکھنا شروع کیا تو دو سال تک لکھا۔ اسی طرح ہندی کے دوسرے مشہور رسالے 'ساپتا ہک ہندوستان' میں بھی کافی عرصہ ہماری تحریریں ترجمہ ہو کر چھپتی رہیں۔ فی الحال 'نیا گیانودئے' میں چھپتی رہتی ہیں۔ پنجابی، گجراتی کے علاوہ انگریزی اور جاپانی میں بھی ترجمہ ہو کر ہماری تحریریں ادھر ادھر شائع ہوتی رہیں۔ زندگی نے اتنا موقع نہ دیا کہ ہم ان کو یکجا کر پاتے۔ جو کچھ جو لوگ بتا دیتے تھے کہ فلاں جگہ یہ چھپا ہے، فلاں جگہ وہ چھپا ہے، وہی سب ذہن میں محفوظ ہے۔ وہی بتا سکتا ہوں۔

آپ نے اچانک حیدرآباد کو الوداع کہہ دیا تھا یا کوئی باقاعدہ پلان تھا دہلی ہجرت کا؟

اب وہ تو ایک اتفاق تھا کہ ۱۹۶۶ء میں زندہ دلان حیدرآباد کی جانب سے ہم نے اردو مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس منعقد کی تھی۔ جسکی صدارت کے لئے کرشن چندر کو مدعو کیا اور اس کا افتتاح مخدوم محی الدین نے کیا۔ پورے ہندوستان سے لوگوں نے اس میں شرکت کی اور یہ خوب کامیاب رہی۔ اس کانفرنس میں کرشن چندر سے ہوئی ملاقات ہی دہلی جانے کا سبب بنی۔ اس کے بعد غالباً ۱۹۶۸ء کی بات ہے کہ سرشر نگار سنسد میں مجھے شامل ہونے کا موقع ملا اور اس میں جب ہم نے ایک خاکہ پڑھا تو میری دھوم مچ گئی۔ خوب پذیرائی ہوئی۔ اس محفل میں 'دھرم یُگ' کے ایڈیٹر کنہیا لال نندن سمیت تمام لوگ بھی موجود تھے اور وہاں سے لوگوں نے مجھے پہچاننا شروع کر دیا حالانکہ ہندی میں ہماری تحریریں پہلے ہی سے چھپنے لگیں تھیں۔ کرشن چندر اور کنہیا لال نندن کی ایما پر ہی میں دہلی پہنچا اور وہاں ملازمت اختیار کر لی۔ دہلی پہنچ

کر زندگی نے دوسری مرتبہ زبردست کروٹ بدلی۔ اردو تو اردو ہندی والوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ہمیں اندازہ ہی نہ ہوا کہ ہم کب کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ حد تو یہ ہے کہ خوشونت سنگھ جیسا کروفر والا ادیب بھی ہمارا گرویدہ ہو گیا۔ بھلا ہو لکشمی چند گپتا جی کا جنہوں نے میری تحریروں کو اردو سے ہندی میں ترجمہ کر کے 'دھرم یگ' میں شائع کیا اور مجھے تمام دوسری زبانوں کے تخلیق کاروں اور قلمکاروں سے روشناس کرا دیا۔ یہ دہلی کا ہی کمال تھا کہ جاپان جانے کا موقع فراہم ہوا۔ 'جاپان چلو جاپان چلو' کے شائع ہونے کے بعد تو پھر زندگی نے کبھی پلٹ کر پیچھے دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ہندی والوں نے وہ پیار دیا، اتنا لکھوایا اور اتنا چھاپا کہ ہم کو زیادہ تر لوگ ہندی کا ہی سمجھنے لگے تھے۔ اب بھی ہندی میں پڑھنے والے سیکڑوں لوگوں کے فون آتے ہیں۔ ہندی کے سارے بڑے ایڈیٹرز میری تحریروں کو جب تب چھاپتے رہتے ہیں اور یہ سب دہلی پہنچنے کے بعد ہی ہوا۔ میرے ۳۵ سالہ دہلی قیام کے تمام قصے اور کئی انٹرویو کتابوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ دہلی میں ملنے والے تمام لوگوں پر خاکے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اب مزید بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

کیا آپ نے کوئی کتاب دہلی کے نام معنون کی ہے؟

نہیں! لیکن ہر جگہ دہلی کا ذکر کیا، ہزاروں مرتبہ، ہر کالم میں، ہر خاکے میں ذکر کیا کہ دہلی میں ہی مجھے سب سے زیادہ شہرت ملی۔ دہلی نے وہ سب کچھ دیا جو کسی نے نہیں دیا، حیدرآباد نے تو مجھے صرف طنز و مزاح لکھنے کی اجازت دی تھی، جو کچھ ملا وہ دہلی سے ہی ملا۔ عزت، دولت، شہرت سب دہلی سے ملی۔ دہلی کا میں اپنے آپ کو بہت مقروض مانتا ہوں۔ وہاں جو میرے پاس اسکوٹر تھا، جس پر تمام بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کو بٹھا کر میں ادھر ادھر جایا کرتا تھا۔ ان سب یادوں کو 'اسکوٹر کی یادیں' میں نے یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔

کیا یہی وجہ ہے کہ آپ کی تحریروں میں حیدرآباد کی اردو کی جھلک بالکل نظر نہیں آتی؟

کہہ سکتے ہیں آپ، لیکن دراصل بچپن ہی سے میں اساتذہ کا کلام اور مشاہیر کی اردو کتابیں پڑھتا آیا تھا، زبان میں پختگی، مجھے نہیں پتہ کہ کب آ گئی، مگر محسوس ہوتا ہے کہ ابتدا میں ہی آ گئی تھی لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ حیدرآباد کی اردو سے میری تحریریں مبرا رہی ہوں۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ تمام جگہ ہم نے حیدرآباد کے مقامی الفاظ کا برمحل استعمال کیا ہے۔

دہلی کی ایک محفل میں مجتبیٰ حسین، اوتار سنگھ جج اور قتیل شفائی

شام ہو گئی تھی اور مجتبیٰ صاحب کی ٹہل کا وقت ہونے والا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ اب چلنا چاہئے کہ ان کی روز شام کی اس ایکسرسائز میں مجھے مخل نہیں بننا چاہئے لہٰذا اگلے دن ملاقات کے وعدے کے ساتھ الوداع لی۔ واپس ہوٹل آیا۔ رات میں ہوٹل کے ہی ایک مخصوص نظام ریستوراں میں حلیم کھایا تو ساتوں طبق روشن ہو گئے اور شب بخیر کی جگہ حیدرآباد کا شکریہ ادا کر کے سو گئے۔

پروفیسر بیگ احساس کے توسط سے اگلے دن حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی میں اردو ریسرچ اسکالرس کے ساتھ ایک ملاقات طے تھی۔ اس میں 'نیا دور' اور اتر پردیش میں اردو کے حالات پر ان اسکالرس سے انٹریکٹ کرنا تھا لیکن سابق وزیر اعظم ہند اٹل بہاری واجپئی جی کے انتقال کی خبر آ گئی۔ اس ناگہانی کے سبب حیدرآباد سمیت پورے ملک میں رنج و الم کی لہر دوڑ گئی لہٰذا سارے طے شدہ پروگرام منسوخ کر دئے گئے اور ہمیں یوپی میں اردو کے حالات بیان کرنے سے بھی چھٹکارا مل گیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ مجتبیٰ صاحب سے بات چیت کی جائے یا پھر کچھ اور، تو فال یہ نکلا کہ حیدرآباد گھوما جائے۔ مجتبیٰ صاحب کو فون کیا کہ آج چونکہ ہم سب سوگوار ہیں اس لئے کوئی کام نہیں کریں گے پھر ہم چل دئے حیدرآباد گھومنے، اولا کرنے کے بجائے ہم نے آٹو کیا۔ بنجارہ ہلس اور جبلی ہلس کی چڑھتی اترتی خوبصورت سڑکوں کے ارد گرد خوبصورت سجی سجائی دکانوں اور اپارٹمنٹ کے پس پشت خوبصورت لینڈ اسکیپ۔ حیدرآباد کی اس قدرتی خوبصورتی کی تعریف کئے بغیر بات نہیں بنتی۔ یہ دیدہ زیب اور خوبصورت مناظر دیکھتے دیکھتے ہائی ٹیک سٹی پہنچ گئے۔ حیدرآباد کا یہ حصہ جدید ہندوستان کے ترقی یافتہ خواب کی تعبیر کے مماثل ہے۔ یہاں سے ہندوستانی شہریوں کو تھوڑی دیر کے لئے ہٹا دیا جائے اور اس خطے پر ڈھیر سارے فرنگی اتار کر اس جگہ کا فوٹو لیا جائے تو کوئی پہچان ہی نہیں سکتا کہ یہ ہندوستان ہے یا یورپ۔ یہاں پہنچ کر ہندوستانی شہریوں کا یہ کمال ہمیں فخر سے بھر دیتا ہے۔ سب کچھ بن چکا ہے، سیکڑوں کمپنیاں چل رہی ہیں، نہ جانے کیا کیا ہو رہا ہے۔ تکنیکی سیاروں (سٹیلائٹس) سے بازگشت کے منظم آلات سے لیس اس ہائی ٹیک سٹی میں اب بھی جدھر نگاہ ڈالو ایک اونچی عمارت کے پشت میں کوئی تعمیر چل ہی رہی ہے۔

یہی راستہ جب آگے بڑھتا ہے تو مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی تک پہنچتا ہے اور آگے قلی قطب شاہ کی درگاہ تک جاتا ہے لیکن یہاں تک آتے ہوئے ہم نے بنجارہ ہلس اور جبلی ہلس کے اطراف اس قدر قدرتی سبزہ زار سمیت اتنا کچھ دیکھا اور محسوس کیا تھا کہ ذرا بھاری پن آ گیا تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی، الٰہ آباد سے اسرار گاندھی، یہ سن کر کے کہ میں حیدرآباد میں ہوں، انہوں نے حیدرآبادی بریانی کی شان میں وہ وہ قصیدے پڑھے کہ بھاری پن غائب ہو گیا اور بھوک جاگ گئی۔ وہ یوں گویا تھے کہ دم کی ہوئی حیدرآبادی بریانی کی دیگوں سے بھرا ایک ہوائی جہاز روزانہ دبئی جاتا ہے۔ جناب! یہ سلسلہ برسوں سے جاری ہے اور آپ کو بتاؤں کہ عرب ممالک میں رہنے والے حیدرآباد کے تمام لوگ اس بریانی کے لئے دو دو تین مہینے پہلے بکنگ کراتے ہیں تب ان کا نمبر آتا ہے۔ ہم نے پوچھا، اس کی تصدیق کیسے ہوگی؟ آپ کو کیسے معلوم؟ جواب میں بولے: ارے بھئی! اخبار میں چھپا تھا، میں نے پڑھا ہے۔ میں نے اس بحث میں پڑنے کی مزید گنجائش نہیں سمجھی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے لیکن بھوک تو لگ ہی گئی تھی حیدرآباد کی بریانی کے نام پر۔ اسرار گاندھی نے ہی ہمیں وہیں تھوڑی دور پر موجود پیراڈائس ریستوراں جانے کی صلاح دی۔ پہنچنے تو نمبر آنے میں تھوڑا سا وقت لگا، بریانی آئی تو اس میں چکن کا اتنی بڑی بوٹی نکلی جتنی اپنے وہاں بڑے کی بوٹی بھی نہیں ہوتی ہے۔

اپنے لکھنؤ کی بریانی کو یاد کر کر کے اس بریانی کو کھاتے ہوئے بار بار ذہن میں ایک ہی سوال آ رہا تھا کہ حیدرآباد کی بریانی اتنی مشہور کیونکر ہے؟ اپنے لکھنؤ میں بریانی کے ساتھ دہی لہسن سے بگھرا ہوتا ہے تو یہاں کے دہی میں ادرک کا غلبہ ہوتا ہے۔ لکھنؤ کی بریانی میں کیوڑے کے ساتھ کھانے والے عطر اور الائچی کے مرکب میں جاوتری اور بھنی پیاز شامل ہوتی ہے اس کی جگہ حیدرآباد کی بریانی میں بڑی الائچی اور کھڑے گرم مسالے پیس کر ڈال دئے جاتے ہیں اور دم لگاتے وقت دہی بھی چھڑک دیا جاتا ہے جس سے ایک مخصوص قسم کی کھٹاس وہاں کی بریانی میں پیدا ہو جاتی ہے جبکہ لکھنؤ کی بریانی کیوڑے اور عطر سے مہک رہی ہوتی ہے۔ حیدرآباد کی بریانی کا چاول ضرور بڑا بڑا ہے لیکن کچھ زیادہ ہی بڑا نہیں ہے کیا! اس کے باوجود یہ اتنا خالی خالی کیوں ہے؟ مسالے کیوں نہیں لپٹے ہیں اس سے؟ لکھنؤ کی بریانی کی دیگ کھلتی ہے تو یخنی کی پرتیں نظر آتی ہیں اور اسے کاٹنے کا فن بھی سب کو نہیں آتا لیکن حیدرآباد کی بریانی کی یکسانیت ہی اس کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اسی لئے اسے کھانے میں بہت زیادہ تزک و احتشام کی ضرورت نہیں ہے۔ لکھنؤ کی بریانی اپنے آپ میں مکمل ڈش ہے۔ جب کہ حیدرآباد کی بریانی کے ساتھ بگھرے بیگن، لقمہ اور ماہی کباب کا بھی جوڑ ہے۔ بریانی کی طرح لکھنؤ کے کباب کو بھی ایک انفرادیت حاصل ہے۔ ان کے لئے گول توے پر سکنے والے کاغذی پراٹھے کافی ہیں۔

دہلی کی ایک محفل میں مشہور آرٹسٹ ایم ایف حسین، صادقین اور دیگر احباب کے ساتھ (۲۵ دسمبر ۱۹۸۱ء)

بھلا ہو اسرار گاندھی کا کہ ان کے مشورے پر ہم نے ہائی ٹیک حیدرآباد کی بریانی کا ذائقہ لے ہی لیا۔ ادھر ادھر ٹہلنے، ہائی ٹیک سٹی کی سڑکوں پر یوں ہی مٹر گشتی کرتے کرتے میری نگاہ کئی ایسے ریستوراں پر گئی جو عربی نژاد تھے۔ اس طرح کے ریستوراں ہم نے دلی میں بھی نہیں دیکھے ہیں۔ اس ہائی ٹیک خطہ میں اب تک ہم کم سے کم پان کی چار پانچ دکانیں دیکھ چکے تھے جن میں بیٹھے ہوئے دکانداروں کے سروں پر دو پلی ٹوپی موجود تھی۔ تھکان نے جسم کو شل کرنا شروع کیا تو ہم آٹو لے کر واپس ہوٹل آ گئے۔

اگلے دن دوپہر بعد ہم پھر پہنچ گئے مجتبیٰ صاحب کے گھر اور بات چیت آگے بڑھانا چاہ ہی رہے تھے کہ مجتبیٰ صاحب اپنے اور اٹل بہاری واجپئی جی سے اپنے رشتوں کی بات کرنے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ آج یہ جو آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں چھڑی لے کر چلتا ہوں، ٹھیک سے چل نہیں پاتا ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ شاید آپ کو یاد ہو کہ اٹل جی کے گھٹنوں کا آپریشن دہلی کے ایمس میں ہونا تھا۔ ساری تیاری مکمل ہو چکی تھی جو گھٹنے اٹل جی کو لگائے جانے تھے وہ بھی آ چکے تھے کہ عین وقت پر یہ سرجری ٹال دی گئی۔ میں بھی گھٹنے بدلوانے والوں کی لائن میں تھا۔ جس ڈاکٹر کو اٹل جی کا آپریشن کرنا تھا، وہ میرا بھی مداح تھا۔ جب اٹل جی کا آپریشن منسوخ ہو گیا تو اس نے کہا، آیئے! وہ گھٹنے میں آپ کے لگا دیتا ہوں اور دیکھئے کہ میں آج تک کس حال میں ہوں۔ اپنے ساتھ ہوئی اس مسخری کو میں نے (اٹل بہاری کے سلسلہ میں تحریر کردہ خاکہ) میں لکھا ہے۔ اور کیا بتاؤں، پڑھ لیجئے گا۔

مجتبیٰ صاحب! یہ بتایئے کہ طنز و مزاح میں آپ کا رول ماڈل کون ہے یا یوں کہ آئیڈیل کون ہے؟ کس سے سب سے زیادہ متاثر ہیں؟

مارک ٹوئن ہمارا قابل قدر اور قابل احترام مزاح نگار ہے۔ اس کے یہاں جو طنز ہے، مزاح کی جو شائستگی ہے، اس کے اندر جو عجز ہے، وہ اور کہیں نہیں ملتا۔ اس کی تقلید شاذ و نادر ہی ہو پائی۔ وہ بہت بڑا طنز و مزاح نگار تھا۔ اس کے جیسا دوسرا کوئی نہیں پیدا ہوا۔

اردو میں اگر بات کی جائے تو؟

بلاشبہ مشتاق احمد یوسفی۔

چلئے ٹھیک ہے۔ مارک ٹوئن اگر سب سے

نظام کلب حیدرآباد میں ڈاکٹر گل رعنا کی کتاب 'مجتبیٰ حسین اور فن طنز و مزاح نگاری' کی رسم اجراء کے موقع پر پدم شری مجتبیٰ حسین، زاہد علی خاں، نیر اعظم، محمد شجاعت علی راشد، پروفیسر فاطمہ بیگم پروین، محمد عبدالحق، ڈاکٹر گل رعنا، پروفیسر محمد بیگ احساس، سہیل وحید اور پروفیسر اشرف رفیع (۱۸/اگست ۲۰۱۸ء)

عظیم طنز و مزاح نگار ہے تو اس کے بعد کس کا نمبر آتا ہے؟

پی جی وُڈہاؤس، افسوس! کہ پی جی وڈہاؤس کی کسی بھی تحریر کا اردو یا ہندی میں ترجمہ موجود نہیں ہے۔ غالباً کوئی کر ہی نہیں پایا۔ اتنا شٹل ہے اس کا لکھا ہوا کہ ہر کوئی سمجھ ہی نہیں پاتا ہے، اس کا مزاح پیچیدہ کہہ کر چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ وہ بھی کم بڑا مزاح نگار نہیں ہے۔ اسے پڑھنا چاہئے۔ اس کا اسٹائل بڑا پیارا ہے جیسے مارک ٹوئن اپنے انداز کا اچھوتا مزاح نگار ہے ویسا ہی پی جی وڈہاؤس بھی ہے۔

طنز و مزاح کے علاوہ ادب میں آپ کس سے متاثر ہیں یا کون آپ کا پسندیدہ ہے؟

ارے صاحب! بڑی لمبی فہرست ہے۔ کہاں تک بتاؤں۔ ابتدا میں روسی ادب سے بہت متاثر ہوا، بہترین ادب ہے یہ۔ ٹالسٹائے، چیخوف کے علاوہ اور بھی ادیبوں کو پڑھا لیکن چیخوف کے یہاں طنز بھی ملتا ہے۔ ٹالسٹائے کے یہاں بھی طنز ہے اور جہاں تک اردو کی بات ہے تقریباً سبھی کو پڑھا۔ اردو میں ابتداءً تو طنز و مزاح کو اوّلیت دی جاتی تھی۔ سب سے اعلیٰ ادب تسلیم کیا جاتا تھا اور ادب عالیہ کے زمرے میں اس کا شمار کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہمارے یہاں اسی ماحول کے پروردہ ایک سے ایک بڑے طنز و مزاح نگار بھی پیدا ہوئے اور ہمارے عہد کا سب سے بڑا طنز و مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی، جن کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی غالباً واحد مزاح نگار ہیں جنہوں نے مزاحیہ انداز میں اپنی خودنوشت بھی لکھی؟

آپ کا خیال صحیح ہے۔ یہ واحد مزاحیہ سرگزشت ہے۔ یہ ایک لاجواب سوانح عمری ہے۔ جس میں انہوں نے تقسیم ہند سے لے کر بینک کی ملازمت تک کے واقعات لکھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کن نامساعد حالات میں اپنی زندگی گزاری۔

مزاح نگار نے اتنے منظم انداز میں لکھا ہو۔ ایک ایک جملے کو دس دس بار لکھتے تھے۔ اس کے بعد دوبارہ پڑھتے تھے۔ کچھ دن رکھ دیتے تھے۔ اس کے بعد پھر پڑھتے تھے اور مناسب تبدیلیاں اور ترمیم کرتے تھے۔ نہ صرف وہ لفظوں کا بلکہ فل اسٹاپ اور کاما تک کا خیال رکھتے تھے۔ یوسفی کی تحریروں میں جتنے الفاظ استعمال ہوئے وہ گہری سوچ بچار اور غور و خوض کا نتیجہ ہیں۔ ایسا زیرک مزاح نگار اردو ادب میں کوئی اور نہیں ہے۔

میں نے عوام میں مقبولیت کی وجہ پوچھی تھی؟

یوسفی کا اسلوب آسان نہیں ہے۔ وہ بہت ہی سنجیدہ قرأت کا مطالبہ کرتا ہے۔ یوسفی کے اندر علم کا خزانہ تھا۔ وہ نہ صرف اردو بلکہ گجراتی، انگریزی اور دیگر

ہم نے اپنے فطری عجز و انکسار کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اتنی عمر میں بھی اور آج بھی اپنے آپ کو مزاح نگار نہیں مانتا۔

یوسفی کی تحریریں خواص کے لئے ہیں۔ جب تک قاری اردو ادب کی تاریخ سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتا ان کی تحریر سے لطف نہیں اٹھا سکتا۔ جگہ جگہ حالی، شبلی، ابوالکلام آزاد وغیرہ کے حوالے ملتے ہیں۔ پھر ان کی عوام میں مقبولیت کی کیا وجہ ہے؟

یوسفی بڑے اہتمام سے لکھتے تھے۔ شاید ہی کسی

زبانوں کے الفاظ کا سوچ سمجھ کر استعمال کرتے تھے۔ ان کے جملوں کی ساخت کچھ ایسی ہوتی تھی کہ سیدھے دل پر اثر کرتی تھی۔ ہر پیراگراف بار بار پڑھنے کے بعد ہی صحیح لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر جملے اقوال کے روپ میں یاد رکھے جاتے ہیں۔ خواص کے علاوہ عوام کی دلچسپی کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔

آپ کی ہر اردو تحریر کا ہندی میں ترجمہ ہو

گیا، یوسفی کی مزاحیہ تحریروں کا ترجمہ ابھی تک ہندی میں کیوں نہیں ہو پایا؟

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ یوسفی صاحب بڑے تزک و احتشام سے لکھتے تھے، پلاننگ کے ساتھ لکھتے اور لکھنے کے بعد ان کے وہاں تصحیح کا عمل بھی چلتا رہتا اور سب سے خاص بات یہ کہ اردو ادب کی علامتوں اور اردو کے روایتی محاوروں کا وہ اپنی تحریروں میں جس پس منظر کے ساتھ استعمال کرتے تھے، اسے کسی دوسری زبان میں تب تک تبدیل نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ اردو کے اس پس منظر سے مکمل واقفیت حاصل نہ کرلی جائے۔

کل کی طرح آج پھر شام ہو گئی اور تقریباً وہی وقت ہو گیا جب مجتبیٰ صاحب کو روز سیر پر جانا ہوتا ہے۔ سیر کیا اسے کار سیر کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ وہ کہیں نہیں جاتے ہیں، وہ یوں ہی حیدرآباد کی شاہراہوں سے گزر کر لوٹ آتے ہیں۔ لوٹنے کے بعد آدھا گھنٹا چھڑی کے سہارے واک کرتے ہیں۔ ان کے اس معمول نے ہی بقول ان کے انہیں بڑھاپے میں بھی تر و تازہ بنائے رکھا ہے۔ در اصل یہی ہے ان کے جسم کی ضرورت اور یہی ہے ان کی دوا جو انہیں ابھی تک توانا بنائے ہوئے ہے۔

اسی شام کو حیدرآباد کے مشہور نظام کلب میں 'مجتبیٰ حسین اور فن طنز و مزاح نگاری' پر ڈاکٹر گل رعنا کی کتاب کی رونمائی کی تقریب طے تھی۔ ہم لوگ وقت پر پہنچ گئے۔ مجتبیٰ صاحب بھی وقت سے ذرا پہلے ہی آئے، گل رعنا اور ان کے شوہر عبدالحق نے بڑھ کر مجتبیٰ صاحب کا خیر مقدم کیا۔ باقی احباب بھی وقت پر موجود تھے۔

میرا بڑھاپا اپنے شباب کو پہنچ چکا ہے۔ اس سے زیادہ بوڑھا ہونا بھی نہیں چاہئے۔

رونمائی کی تقریب شروع ہونے کو تھی لیکن فضا بھاری تھی۔ تابندہ تہذیبی اثاثے سے بھرپور نظام کلب کی رونق بھی اس فضا کو بھید نہیں پا رہی تھی۔ اٹل بہاری واجپئی جی کی رحلت شاید نظام کلب کے شاندار ماضی پر بھاری پڑ رہی تھی۔ زیادہ تر مہمانوں نے پھولوں کے گلدستے سے پرہیز کیا تھا کہ قومی غم پر کہیں آنچ نہ آجائے۔

جلسے کی نظامت ڈاکٹر شجاعت علی کے ذمہ تھی۔ انہوں نے بڑھ کر مجھ سے بڑی گرمجوشی سے اپنے یوپی

نظام کلب حیدرآباد میں منعقد تقریب رونمائی میں مجتبیٰ حسین کے ساتھ پروفیسر بیگ احساس اور سہیل وحید

کے رشتوں کے بارے میں بتایا۔ جلسہ شروع ہوا تو ایک ایک کرکے لوگوں کو ڈائس پر آنے کی دعوت شجاعت صاحب دینے لگے۔ سب نے کرسیاں سنبھال لیں تو شروع ہوا پھول کی جگہ پھل کی چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں پیش کرنے کا سلسلہ۔ گل رعنا کے شوہر عبدالحق اور دوسرے احباب نے شال کے ساتھ اسٹیج پر موجود مہمانوں کو پھلوں کی ٹوکری پیش کی، چہ می گوئیوں سے سمجھ میں آیا کہ اٹل جی کے انتقال کے سبب نظام کلب نے اس شرط پر ہی اس جلسہ کی اجازت دی تھی کہ ایسا کچھ نہ کیا جائے کہ تقریب کی خوشیاں کسی بھی طور پر عیاں ہونے لگیں۔ اس تنبیہ کے باوجود کچھ لوگوں سے رہا نہ گیا اور وہ پھولوں کا گلدستہ گل رعنا کے لئے لے ہی آئے۔ بہرحال اس کے بعد گل رعنا کی تصنیف 'مجتبیٰ حسین اور فن طنز و مزاح نگاری' پیکٹ سے نکالی گئی، مجتبیٰ حسین، زاہد علی خاں، بیگ احساس سمیت سبھی نے کتاب کی رونمائی کی رسم ادا کی۔

مجھے یقین نہیں ہوتا کہ میں اتنا اچھا کیسے لکھ لیتا ہوں۔

اس کے بعد ڈاکٹر شجاعت علی کو نہ جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے سب سے پہلے اس خاکسار کو ہی دعوت سخن دے دی جب کہ ابھی چند لمحہ پہلے ہی انہوں نے راقم الحروف کو اپنے استقبالیہ خطبے میں بطور مہمان خصوصی متعارف کرایا تھا اور بیک ڈراپ پر بھی میرے نام کے نیچے مہمان خصوصی تحریر تھا۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ مجھے افتتاحی کلمات پیش کرنا پڑیں گے۔ بہرحال! مرتا کیا نہ کرتا، یہ سوچ کر کہ رسم دکن شاید یہی ہو، میں پوڈیم کی طرف بڑھا اور جو کچھ سوچا تھا اس سے مبرا پانچ سات منٹ مجتبیٰ صاحب کے لئے جو یاد آتا رہا، کہا، لیکن بطور خاص یہ ضرور کہا کہ قلی قطب شاہ، مخدوم محی الدین، واجدہ تبسم اور مجتبیٰ حسین .... یہ حیدرآبادی سلسلہ ختم نہیں ہونا چاہئے۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر اشرف رفیع، پروفیسر فاطمہ پروین، شاذ تمکنت کے بھائی امتیاز الدین، وغیرہ نے اظہار خیال کیا اور حتمی طور پر یہ بات سامنے آئی کہ مجتبیٰ حسین کی تحریروں پر حیدرآباد سے زیادہ اتر پردیش اور بہار میں تحقیقی کام ہوا ہے اور ہو بھی رہا ہے۔ ان کی مزاح نگاری پر پی ایچ ڈی اور ایم فل

اتر پردیش، دہلی اور بہار میں ہی سب سے زیادہ ہوئے ہیں۔مجتبیٰ حسین نے دانستہ یا نادانستہ طور پر اپنی تحریروں میں خواتین کی نمائندگی سے پرہیز کیا ہے۔

حیدرآباد کے معروف اردو روزنامہ 'سیاست' کے مدیر جناب زاہد علی خاں نے مجتبیٰ حسین صاحب کو 'سیاست' کے پہلے قاری ہونے اور 'سیاست' سے برسوں وابستہ رہنے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے بڑی محنت سے یہ ذمہ داری نبھائی۔انہوں نے کہا کہ حیدرآباد کو یہ فخر ہے کہ یہاں مجتبیٰ حسین جیسے قدآور مزاح نگار موجود ہیں۔اپنی تقریر کے دوران انہوں نے راقم الحروف کی طرف طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا کہ تیلنگانہ حکومت نے اردو کے بجٹ میں جو اضافہ کیا ہے وہ ہندوستان میں سب سے زیادہ ہے۔اپنے صدارتی خطبہ میں معروف افسانہ نگار پروفیسر بیگ احساس نے مجتبیٰ صاحب کی تحریروں کے حوالے سے ایک مختصر لیکن جامع تقریر میں مزاح پیدا کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین کو اردو مزاح نگاری کا ابتا بھ بچن قرار دیا اور یوسفی صاحب کو دلیپ کمار۔

اخیر میں مجتبیٰ صاحب کے سامنے جب مائک رکھا گیا تو انہوں نے سب سے پہلے گل رعنا کے شوہر عبد الحق کو عالمی فوٹو گرافی کا عبد الحق کہا اور گل رعنا کے تئیں اپنی شفقت کا اظہار کرتے ہوئے تعریفی الفاظ میں کہا کہ اس کتاب سے پہلے بھی کئی کتابیں ان پر شائع ہو چکی ہیں اور انہیں خطرہ یہ ہے کہ ان کی کتابوں سے زیادہ کہیں ان پر کتابیں شائع نہ ہو جائیں۔اپنے مخصوص انداز میں مجتبیٰ حسین نے مصنفہ سے زیادہ ان کے شوہر کے لئے توصیفی کلمات پیش کئے اور جلسہ ختم ہوا۔

بعد از تقریب عشائیہ میں حیدرآبادی بریانی کے ساتھ مہمانوں نے دوسرے لوازمات کا لطف لیا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور زاہد علی خاں سے پوچھا کہ تلنگانہ اردو اکادمی کا بجٹ کتنا ہے۔ایک لمحہ کے تاسف کے ساتھ انہوں نے مجھے بغور دیکھا اور کہا کہ یاد نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ 'سیاست' جیسے معتبر اخبار کے مدیر نے یہ بات کس وثوق سے کہہ دی کہ تلنگانہ اردو اکادمی کا بجٹ ہندوستان کی دوسری تمام اسٹیٹ اکادمیوں سے زیادہ ہے۔دوران عشائیہ جیسی چپقلش، چہ می گوئیاں، گہما گہمی، ہنسی مذاق اور پر لطف بذلہ سنجی، دہلی اور لکھنؤ کی محفلوں میں رہتی ہے وہ یہاں مفقود تھی۔

اگلا دن حیدرآباد کے قیام کا آخری دن تھا۔واپسی کی تیاری کرنی تھی اور بچے وقت میں درگاہ قلی قطب شاہ اور سالار جنگ میوزیم دونوں جگہ میں کسی ایک جگہ جانے کی کوشش تھی، لیکن وقت کم تھا۔ طے پایا کہ میوزیم چلا جائے۔اس کی شان وشوکت حیدرآباد کے شاندار ماضی کے قصیدے کہہ رہی تھی۔ نظام کے خاندان، نظام کی آسائشوں، عیش وآرام کے ساتھ ان کے دور حکومت میں دکن کی ادبی، تہذیبی وثقافتی زندگی کی جھلک یہاں بھرپور طریقہ سے موجود تھی۔نظام نے زبان، ادب، تہذیب و تمدن اور دکن کی ثقافت کی ترویج اور ترقی میں کوئی کور کسر باقی نہیں رکھی تھی، یہ یہاں آکر صاف نظر آرہا تھا۔میوزیم کے در و دیوار پر اردو کا غلبہ صاف دیکھا جاسکتا ہے لیکن حیرت یہ بھی ہوئی کہ فن سنگ تراشی کے شاہکار نمونوں کے درمیان یہاں بھی اب کچھ ایسے مجسمے نصب کر دئے گئے ہیں جن کی موجودگی بصارت پر بار ہے۔شام کو ہم پھر مجتبیٰ صاحب کے گھر پہنچ گئے کہ چلتے چلتے آج پھر ان سے ملاقات کر لی جائے۔ وہ بھی بڑے جذباتی انداز میں ہم سے ملے۔ اپنی بیگم سے ہمارے لئے چائے بنوائی۔ چائے پی رہے تھے تو ہم نے پوچھ ہی لیا کہ

مجتبیٰ صاحب! آپ نے کہا کہ آپ نے بھرپور زندگی جی، دوستوں کے درمیان خوب اٹھے بیٹھے، ادھر ادھر آئے گئے لیکن آپ نے اپنی اہلیہ کے بارے میں کہیں کچھ نہیں لکھا کہ انہوں نے کس طرح آپ کو موافق ماحول مہیا کرانے میں مثبت کردار ادا کیا؟

نہیں! ایسا بالکل نہیں ہے۔ میں نے ان کا بارہا ذکر کیا ہے۔ناصرہ کے بغیر ہمارا وجود نامکمل ہے۔انہوں نے گھر کو سنبھالے رکھا اور بچوں کی پرورش میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔اسی لئے تو ہم لکھ سکے ورنہ اگر گھر کے جھمیلوں میں ناصرہ نے ہم کو پھنسا دیا ہوتا تو یہ مجتبیٰ حسین آپ کو اس طور پر تو ہرگز نظر نہیں آتا اور یہ ناصرہ ہیں کون؟ یہ دراصل ہماری چچازاد بہن ہوا کرتی تھیں کہ ایک دن ہم نے ان کو اپنی قمیص میں بٹن ٹانکنے کو کیا دیا کہ ان کے گھر والوں نے ان کو ہمیں سے ٹانک دیا۔

تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد ہم نے رخصت کی اجازت چاہی، مجتبیٰ صاحب اور زیادہ جذباتی ہو گئے اور چلتے چلتے ہمیں پھر ایک مرتبہ گلے سے لگایا اور خدا حافظ کہہ دیا۔حیدرآباد جب آئے تھے جو جیسا موسم تھا ویسا ہی موسم، اتنا ہی خوبصورت، اتنا ہی خوشگوار اور اتنا ہی سہانا تب بھی ہے جب ہم جارہے ہیں۔حیدرآباد کو اس موسم کی مبارکباد!

مجھے ڈر ہے کہ میری کتابوں سے زیادہ مجھ پر کتابیں نہ شائع ہو جائیں۔

ہم واپس آئے۔ہوٹل سے سامان لیا، اولا پکڑی اور مشہور افسانہ نگار شموئیل احمد کے دروازہ پر دستک دی۔ایر پورٹ کے راستے میں ہی ہندوستان کے اس سب سے طویل بارہ کلومیٹر والے فلائی اوور کے پلر نمبر ۱۷۷ کے پاس ان کی رہائش تھی۔گزشتہ کئی دن سے حیدرآبادی بریانی، پتھر گوشت، بگھارا بیگن، حلیم، ادرک آمیز رائتہ، لقمہ کباب وغیرہ وغیرہ سے معدے کا پتہ نہیں لیکن طبیعت بھر گئی تھی۔شموئیل صاحب کی بیگم کے ہاتھوں کی روٹی اور لوکی گوشت کھایا تو منہ نے پھر سے شمالی ہندوستان کے ذائقہ کی تجدید کر دی۔'دلنگی' سمیت 'گرداب' کے حوالوں کے ساتھ شموئیل احمد سے خوب باتیں کیں اور ایر پورٹ کا باقی بچا راستہ پورا کر کے فلائٹ پکڑی اور لکھنؤ آگئے۔

● سہیل وحید

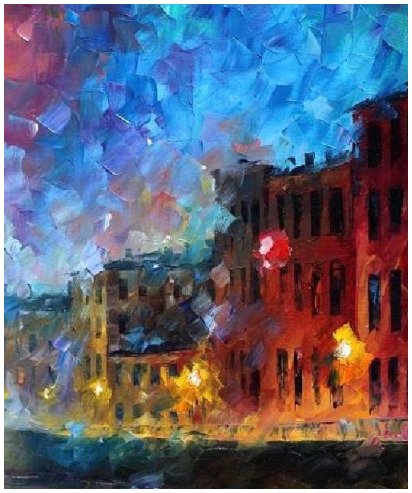

اپنی یاد میں

مجتبیٰ حسین (جنہیں مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آنا چاہئے، مگر جانے کیوں نہیں آرہا) پرسوں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہ ان کے مرنے کے دن نہیں تھے کیونکہ انہیں تو بہت پہلے نہ صرف مرجانا بلکہ ڈوب مرنا چاہئے تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جس دن وہ پیدا ہوئے تھے تبھی سے لگاتار مرتے چلے جارہے تھے۔ گویا انہوں نے مرنے میں پورے اسی سال لگا دئے۔ لوگ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہیں۔ یہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندہ رہے۔ ان کی زندگی بھی قسطوں میں چل رہی تھی اور مرے بھی وہ قسطوں میں ہی۔

جب تک وہ زندہ انہوں نے کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ (پلٹ کر دیکھتے بھی تو کیا دیکھتے، وہاں کچھ تھا ہی نہیں) اصل وجہ یہ تھی کہ مرحوم نے جب اس دنیا میں آنکھیں کھولیں تو دیکھنے کے لئے تو بہت کچھ تھا لیکن کرنے کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ کیونکہ دیش کو آزاد ہونے میں صرف گیارہ برس باقی رہ گئے تھے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ دیش کی آزادی کی جنگ میں بھرپور حصہ لیں۔ لیکن سات آٹھ برس کی عمر میں کون انہیں جنگ آزادی میں آنے دیتا۔ بڑی عمر کے لوگ تو اس جنگ میں پہلے ہی سے مصروف تھے۔ ان کی بڑی تمنا تھی کہ انگریز کی لاٹھی کھائیں۔ چنانچہ جب جب وہ اپنی اس تمنا کا اظہار اپنے والد سے کرتے تو والد کی لاٹھی ضرور کھاتے۔ انگریز کی لاٹھی کھانے میں جو مزہ تھا، وہ باپ کی لاٹھی میں کہاں۔ جن لوگوں نے اس زمانے میں غلطی سے بھی انگریز کی لاٹھی کھائی تھی، انہیں دیکھئے کہ آج کتنے مزے میں ہیں اور آج کتنی اونچی اونچی کرسیوں پر براجمان ہیں۔ چاہتے تو وہ بھی جی کڑا کر کے گیارہ سال کی عمر میں بھی جاتے ہوئے انگریز کی آخری لاٹھی کھا سکتے تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ مرحوم کل نو بھائیوں میں سے ایک تھے اور ان سے اوپر کے پانچ بڑے بھائی اسی کام میں لگے ہوئے تھے۔ ایک ہی خاندان کے کتنے بھائی آخر اس کام میں لگے رہتے۔ اس لئے یہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ مرحوم کی زندگی کی ٹریجڈی یہ تھی کہ وقت ان کی زندگی میں کبھی وقت پر نہیں آیا۔ ہر کام یا تو قبل از وقت کیا یا بعد از وقت۔ گویا زندگی بھر وقت سے آنکھ مچولی کھیلتے رہے۔ یہاں تک کہ آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے ان کا آخری وقت آ گیا۔ شادی بھی کی تو وقت سے پہلے یعنی اس عمر میں کی جب انہیں یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ لوگ شادی کیوں کرتے ہیں۔ چنانچہ شادی کی پہلی ہی رات کو مرحوم اپنے کم عمر دوستوں کے ساتھ چاندنی رات میں کبڈی کھیلنے کے لئے نکل پڑے۔ بزرگ انہیں زبردستی پکڑ کر لے آئے

اورتنہائی میں سمجھایا کہ کبڈی کھیلنا ہی ہے تو اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ کھیلو۔ مرحوم تیار تو ہو گئے لیکن ضد یہی کرتے رہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ کھلی چاندنی میں کبڈی کھیلیں گے۔ انہیں بعد میں پتہ چلا کہ یہ کبڈی چاندنی میں نہیں کھیلی جاسکتی۔ مرحوم کی زندگی میں چاند اور چاندنی دونوں کی بڑی اہمیت رہی۔ پورے چاند کو دیکھ کران کے وجود میں نہ جانے کیا ہو جاتا تھا کہ آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔ اپنی نوجوانی میں جب تک چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں میں رہے وہ چاندنی راتوں میں باولے سے ہو جاتے تھے اور کھیتوں میں بڑی دور تک نکل جاتے تھے۔ پتہ نہیں وہ چاند میں کیا ڈھونڈتے تھے۔ بعد میں وہ روشنیوں سے جگمگائے ہوئے بڑے شہروں میں رہنے لگے اور چاند اور چاندنی دونوں ہی دھندلا گئے تب بھی چاندنی کی تلاش میں اندھیرے راستوں پر نکل پڑتے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ایک عرصہ بعد نیل آرم اسٹرانگ نے چاند پر قدم رکھا۔ یہ ناراض سے ہو گئے کیونکہ نیل آرم اسٹرانگ کو وہ اپنا رقیب سمجھتے تھے۔ کہتے تھے کہ اب چاندنی ان کے لئے کنواری اور اچھوتی نہیں رہ گئی ہے۔ پھر چاندنی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اگر کبھی دیکھا تو ان پر پاگل پن کا دورہ نہیں پڑا کیونکہ اب چاند ان کے لئے پرائی عورت کی طرح تھی۔ رہنے کو گھر نہیں تھا لیکن مرحوم چاند، سورج، ستارے اور ایسی ہی چیزوں پر اپنا پورا حق بنائے رکھنے کی خواہش رکھتے تھے۔ ایسی ہی خواہشوں کی وجہ سے زندگی میں کبھی انہیں سکون نہ مل سکا۔ آدمی اتنا چھوٹا اور خواہشیں اتنی بڑی۔

مرحوم نے زندگی میں ایک بار بھرپور عشق بھی کیا۔ لیکن معاملہ وہی تھا کہ غلط وقت پر کیا۔ دیکھا جائے تو جب انہوں نے زندگی میں سچا عشق کیا تو وہ بہت ہی موزوں تھا کیونکہ مرحوم کی عمر اس وقت اکیس بائیس برس کی تھی اور یہی عمر عشق کرنے کے لئے بہت مناسب ہوتی ہے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس وقت کے آنے سے پہلے ہی مرحوم نے نہ صرف انجانے میں شادی کر لی تھی بلکہ انجانے میں ایک بچے کے باپ بھی بن گئے تھے۔ مرحوم اپنے اس بعد از وقت عشق کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اپنے دل کو یہ تسلی بھی دیا کرتے تھے کہ شادی تو ماں باپ کی مرضی سے کی تھی۔ اب عشق اپنی مرضی سے کریں گے۔ چنانچہ کچھ برس اپنی مرضی سے عشق کرتے رہے یہ اور بات ہے کہ بعد میں محبوبہ نے اس کی اپنی مرضی سے کہیں اور شادی کر لی۔ وقت نے مرحوم کو اپنے عشق کے جوہر دکھانے کا موقع نہیں دیا

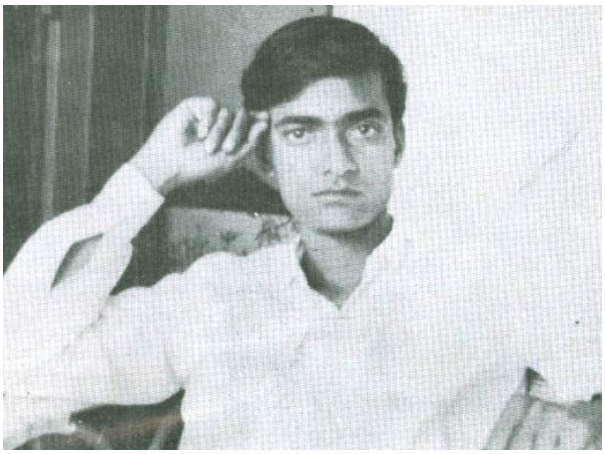

مجتبیٰ حسین کی نوجوانی کی تصویر (۱۹۶۶ء)

ورنہ تاریخ میں ان کا درجہ مجنوں، فرہاد اور رومیو وغیرہ سے کم نہ ہوتا۔ ان کا پہلا عشق تو ناکام ہو گیا لیکن خرابی یہ ہوئی کہ اس وقت تک انہیں عشق کرنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ بعد میں جتنے بھی عشق کئے، عادت سے مجبور ہو کر کئے۔ چنانچہ ادھیڑ عمر میں جب وہ اپنے ماضی کو یاد کر کے لمبی آہ بھرتے تھے خود انہیں پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس 'آہ' کا تعلق کسی بھولی بسری محبوبہ سے ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ان کی بیوی نہ صرف سگھڑ اور وفادار تھی بلکہ اسے ان کے مزاج اور ان کے معاشقوں کا بھی اندازہ تھا۔ پرانے زمانے کی عورت تھی جس کی خواہش صرف اتنی ہوتی ہے کہ اس کا شوہر رات چاہے کہیں بھی گزارے صبح اسے اپنے گھر کے بستر سے ہی اٹھنا چاہئے۔ مرحوم نے ساری زندگی اس کی اس خواہش کا جی جان سے احترام کیا۔ آخری عمر میں تو وہ اپنی بیوی سے بھی چوری چھپے عشق کرنے لگے تھے۔ چوری چھپے اس لئے کہ اس وقت تک مرحوم کے گھر میں دو بہوئیں آچکی تھیں اور نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں کا آنا جانا بھی شروع ہو گیا تھا۔

'ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا'

غلط وقت پر آدمی صحیح کام کرنا چاہے تو ہمیشہ مشکل پیش آتی ہے۔ وقت نے یہاں بھی ان کا ساتھ نہیں دیا۔ آخری عمر میں مرحوم کی اٹوٹ وفاداری کو دیکھ کر ان کی بیوی ہمیشہ اس خواہش کا اظہار کرتی تھیں کہ اس کا دم مرحوم کی بانہوں میں ہی نکلے لیکن مرحوم کی یہ بڑائی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہمیشہ اس کو یہ کہہ کر چپ کرا دیتے تھے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، میں نے جب تمہیں اپنی بیوی بنایا ہے تو اب بیوہ بھی بناؤں گا۔ بیوی بنانا تو میرے اختیار میں نہیں تھا لیکن بیوہ بنانا تو میرے اختیار میں ہے۔ مرحوم بات کے بڑے دھنی نکلے۔ ساٹھ برس سے بھی زیادہ اپنی بیوی کے ساتھ جیسے تیسے گزار کر اسے بیوہ کا درجہ دے کر اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

مرحوم نے جب ہوش سنبھالا (یوں تو ساری زندگی ان کے ہوش اڑے رہے لیکن برا وقت آنے پر کبھی کبھی وہ اپنے ہوش سنبھال بھی لیتے تھے) دیش آزاد ہو گیا تھا لیکن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ آزادی کو لے کر کیا کریں گے۔ عجیب دور تھا۔ نہ صرف دیش تقسیم ہو گیا تھا بلکہ خاندان بھی تقسیم ہو رہے تھے۔ جگہ جگہ فرقہ وارانہ فسادات بھی ہو رہے تھے۔ انہیں دنوں بارہ برس کی عمر میں انہوں نے اپنے ماموں کو ایک فرقہ وارانہ فساد میں اپنی آنکھوں کے سامنے بلوائیوں

کے ہاتھوں ہلاک ہوتے ہوئے دیکھا۔ یہ منظر ان کی آنکھوں میں مرتے وقت تک تازہ رہا۔لیکن اس منظر نے کبھی ان کے اندر انتقام کے جذبات کو پیدا نہیں ہونے دیا۔ یہ ضرور ہوا کہ اس حادثے کو بھلانے کے لئے انہوں نے اپنا زیادہ سے زیادہ وقت دوستوں میں گزارنا شروع کر دیا۔ مرحوم نے اپنی طالب علمی کا زیادہ تر وقت ہاسٹلوں میں گزارا۔ بعد میں اپنی گرہستی بسانے کی باری آئی تو زندگی بھر یوں رہے جیسے کوئی ہاسٹل میں رہتا ہے۔رات کو دیر سے گھر واپس آنا اور دوسرے دن علی الصبح گھر سے نکل جانا مرحوم کا معمول تھا۔ اگر کسی دن غلطی سے جلدی گھر واپس آجاتے تو ان کے گھر والے پریشان ہو جاتے کہ کہیں ان کی طبیعت تو خراب نہیں ہوگئی ہے۔آخری عمر میں تو وہ اپنے آپ کو صحت مند ثابت کرنے کی کوشش میں جان بوجھ کر دیر سے گھر آنے لگے تھے ورنہ ان کے دیر سے گھر آنے کی ساری وجہیں ختم ہو چکی تھیں۔

لوگ اکثر سوال پوچھتے ہیں کہ ایسا بے ڈھنگا آدمی قلمکار کیسے بن گیا۔ سوال پوچھنے والوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ بے ڈھنگا آدمی ہی قلمکار بنتا ہے۔لیکن مرحوم کے ساتھ ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ زندگی میں جو کچھ وہ بننا چاہتے تھے وہ بننے کی کوشش نہیں کی۔ دوستوں اور لوگوں نے انہیں جو کچھ بنانا چاہا تو بنتے چلے گئے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کسی نے انہیں جیب کترا بنانے کی کوشش نہیں کی ورنہ وہ، وہ بھی بن جاتے۔ وہ اپنے دوستوں اور چاہنے والوں کی بات کو کبھی ٹالنے کے قائل نہیں تھے۔ جتنی بھی تعلیم دوستوں کے کہنے سے حاصل کر سکتے تھے، وہ حاصل کی۔ پھر دوستوں کے کہنے پر ہی حیدرآباد کے روزنامہ 'سیاست' میں کام کرنے لگے۔ ان دنوں سرکاری نوکریاں ملنا یوں بھی مشکل تھا۔شروع میں اس اخبار میں سیدھے سادے صحافی کی طرح کام کرتے رہے۔اس اخبار میں طنز و مزاح کا ایک کالم ہوتا تھا جسے اس زمانے کے مشہور ادیب شاہد صدیقی لکھا کرتے تھے۔ یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ایک دن یہ ادیب اللہ کو پیارے ہو گئے تو اخبار کے انتظامیہ نے انہیں حکم دیا کہ وہ طنز و مزاح کا یہ کالم لکھنے کی ذمہ داری سنبھال لیں۔ اس سے پہلے انہیں پتہ نہیں تھا کہ طنز کسے کہتے ہیں اور مزاح کس چڑیا کا نام ہے۔ بہت منع کیا۔ ہاتھ پیر جوڑے کہ یہ کام انہیں نہ سونپا جائے لیکن ان کی ایک نہ چلی۔لوگ پیٹ کے لئے روتے ہیں۔ یہ پیٹ کے لئے ہنسنے لگے۔آدمی کیونکہ ڈرپوک تھے اس لئے اپنے مضامین میں دوسروں کا مذاق اڑانے کے بجائے اپنا مذاق اڑانے لگے۔ یہ سب سے آسان طریقہ تھا مگر بعد میں کچھ تنقید نگاروں نے ان کی تعریف میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ دوسروں کا مذاق تو ہر کوئی اڑاتا ہے لیکن خود اپنا مذاق اڑانا بڑی ہمت کا کام ہے۔اس تعریف سے وہ اتنا خوش ہوئے کہ زندگی بھر کے لئے طنز کے اپنے ہی تیروں سے اپنے آپ کو ہلکان کرتے رہے۔

مجتبیٰ حسین، ظہیرالدین خاں، منیجنگ ایڈیٹر 'سیاست' کے ہمراہ

اتنے کم معاوضے میں شاید ہی کسی نے اپنے آپ کو اتنا لہولہان کیا ہو۔بس اتنی ہی وجہ تھی ان کے طنز نگار بننے کی۔لوگوں نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ چاہتے تو وہ انہیں کسی بڑی کرسی پر بھی بٹھا سکتے تھے لیکن وہاں پہلے ہی سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے اس لئے مرحوم کو زندگی بھر اپنے چاہنے والوں کے سر آنکھوں پر ہی بیٹھنا پڑا اور وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے پندرہ کتابیں لکھیں۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ مرحوم زندگی بھر کبھی وہ نہ بن سکے جو بننا چاہتے تھے، ہمیشہ وہ بنے جو لوگ انہیں بنانا چاہتے تھے۔ عمر کے آخری حصہ میں انہیں پتہ چل گیا تھا کہ طنز و مزاح وہ بالکل نہیں لکھ سکتے کیونکہ اندر سے وہ بہت غمزدہ آدمی تھے۔ دوستوں کی محفل میں جی کھول کر ہنستے بولتے اور قہقہہ لگاتے تھے۔دنیا کو دکھانے کے لئے انہیں ایسا کرنا پڑتا تھا لیکن جب تنہا ہوتے تو یہاں تک سوچتے کہ کیوں نہ خودکشی کر لیں۔ اس معاملے میں دوستوں سے مشورہ بھی کیا۔ ایک دوست نے کہا کہ انہیں خودکشی کر لینی چاہئے۔ وہ اس کے لئے تیار بھی ہو گئے تھے لیکن ٹھیک اسی وقت دوسرے دوست نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ دوستوں کی بات وہ کبھی نہیں ٹال سکتے تھے۔اس لئے دونوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا کہ ان کی خودکشی کے معاملے میں پہلے وہ متفق ہو جائیں تو پھر کوئی فیصلہ کریں۔ دونوں دوست اس معاملہ پر برسوں تبادلۂ خیال کرتے رہے اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔لہٰذا انہیں بیکار ہی زندہ رہنا پڑا۔آخر میں وہ دونوں دوست تبادلۂ خیال کرتے کرتے خود اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مرحوم نے اپنی نوجوانی کے دن حیدرآباد میں گزارے تھے۔انہیں وہ گلیاں ہمیشہ یاد آتی تھیں جن

میں اپنی جوانی کھونے کے علاوہ بہت کچھ کھویا تھا۔ مگر وہ شہر جن میں وہ بعد میں رہے کبھی ان کی زندگی کا حصہ نہ بن سکے۔ جہاں انہوں نے کھویا کم اور پایا زیادہ تھا۔ مرحوم کو گھاٹے کا سودا بہت پسند تھا۔ حیدرآباد سے نکل کر انہوں نے ملکوں ملکوں کی سیر کی اور دلچسپ بات یہ تھی کہ سارے سفر اپنے پلے سے پیسہ خرچ کر کے نہیں کئے۔ ان کے چاہنے والوں نے نہ صرف ان کے سفر کا کرایہ ادا کیا بلکہ سامان سفر بھی دوستوں نے ہی دیا۔ اتنے سارے شہروں کی سیر کرنے کے بعد بھی کوئی شہر ان کے دل میں حیدرآباد کی جگہ نہ لے سکا۔ حیدرآباد کو چھوڑے ہوئے تیس برس بیت گئے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب اس شہر میں ان کے دوست احباب تو کیا رشتے دار بھی کم ہی باقی رہ گئے تھے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں بار بار اس شہر کے چکر لگاتے تھے۔ پتہ نہیں کیا ڈھونڈنے جاتے تھے۔ ان گلیوں اور ان سڑکوں کے خدوخال ہی بدل گئے تھے جہاں وہ کبھی ٹھوکریں کھایا کرتے تھے۔ جہاں اب بڑی بڑی بلڈنگیں کھڑی تھیں۔ انہیں اپنے ذہن سے ہٹا کر وہاں چالیس بچاس برس پرانے کچے پکے مکان کھڑے کر دیتے تھے اور جو کچھ ان کی ننگی آنکھوں کے سامنے اب موجود نہیں تھا اسے دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ حیدرآباد اصل میں ان کے لئے باہر آباد نہیں تھا بلکہ ان کے اندر آباد تھا۔ دوستوں سے بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ حیدرآباد میں بیسویں صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی میں جیسا چاند نکلا کرتا تھا ویسا چاند اب دنیا میں کہیں نہیں نکل پاتا۔ پتہ نہیں کس چاند اور کس سورج کی بات کرتے تھے۔ یوں بھی ایک لمبے عرصے سے انہوں نے چاند کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

مرحوم نے اگرچہ کبھی اپنے آپ کو ادیب نہیں مانا لیکن انہیں کئی اصلی انعامات بھی ملے تھے۔ اصلی انعام اس لئے کہ انہوں نے اور ادیبوں کی طرح ان انعامات کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کبھی کبھی تو انہیں بے شک سا ہونے لگتا تھا کہ کہیں وہ واقعی ادیب تو نہیں بن گئے ہیں۔ مرحوم کی خوبی یہ تھی کہ وہ غلط فہمی میں تو مبتلا ہو سکتے تھے لیکن خوش فہمی کو کبھی اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتے تھے۔ ان کی ناکام و نامراد زندگی کا یہی راز تھا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ مرحوم زندگی بھر راتوں کو دیر سے گھر آنے کے عادی رہے۔ آخری عمر میں جب ان کے پاس دیر سے گھر واپس آنے کی ساری وجہیں ختم ہو چکی تھیں تب بھی وہ راتوں کو دیر گئے تک ایک ویران پارک میں ایک ٹوٹی پھوٹی بینچ پر اکیلے بیٹھا کرتے تھے۔ وہ چاہتے تو کسی خوش نما پارک کی اچھی اور آرام دہ بینچ پر بھی بیٹھ سکتے تھے لیکن کہتے تھے کہ خوش نما اور آرام دہ چیزیں انہیں کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں۔ ویران جگہوں پر بیٹھ کر آدمی کو اپنا سنہرا ماضی اور بھی کھلا اور روشن نظر آتا ہے۔ پتہ نہیں اس بینچ پر بیٹھ کر کیا سوچتے تھے۔ مستقبل کے بارے میں تو وہ سوچ نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کے پاس بچا ہی کتنا تھا۔

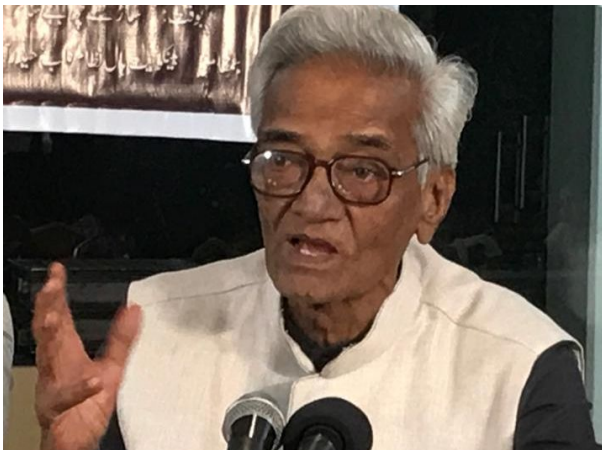

مجتبیٰ حسین ایک پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے (۲۰۱۸ء)

کروڑوں برس پرانی دنیا میں بیسویں اور اکیسویں صدی کے بیچ یہ جو اسی برس انہیں ملے تھے ان سے وہ مایوس بالکل نہیں تھے۔ کبھی کبھی موج میں ہوتے تو اپنا مقابلہ دنیا کی بڑی ہستیوں سے کر کے ان ہستیوں کو آن کی آن میں چت کر دیتے تھے۔ اپنے آپ کو سکندر اعظم سے بڑا اس لئے سمجھتے تھے کہ سکندر اعظم نے لتا منگیشکر کا گانا نہیں سنا تھا۔ اکبر اعظم کو بھی اپنے آگے ہیچ سمجھتے تھے کہ اس نے دیوان غالب نہیں پڑھا تھا۔ ایک بار تو 'جولیس سیزر' کو صرف اس بات پر اپنے سے چھوٹا قرار دے دیا تھا کہ اسے شیکسپیئر کا ڈرامہ 'جولیس سیزر' پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ لوگوں نے سمجھایا کہ 'جولیس سیزر' خود اپنا ڈرامہ پڑھ کر کیا کرتا؟ کہنے لگے کہ 'جولیس سیزر' نے اپنے آپ کو 'شیکسپیئر' کی نظر سے دیکھا ہی کہاں تھا، ایک بار دیکھ لیتا تو اپنی عظمت کا اندازہ ہو جاتا۔ جنگل میں مور ناچا، کس نے دیکھا۔ ایک بار تو بڑے غلام علی خاں کی آڑ لے کر 'نیوٹن' کی ایسی تیسی کر دی تھی۔ حد ہو گئی کہ مرنے سے کچھ دن پہلے وہ 'کارل مارکس' کو صرف اس لئے اپنے سے کمتر سمجھنے لگے تھے کہ 'کارل مارکس' نے بھیم سین جوشی کا گانا نہیں سنا تھا۔

غرض مرحوم ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتیں سوچ کر اپنی بے مزہ اور بے رنگ زندگی میں رنگ بھرتے رہے۔ ان کے سارے دوست ایک ایک کر کے اس دنیا سے اٹھ گئے تھے۔ ان کے لئے ان دوستوں کی یاد کے بوجھ کو اٹھانا دوبھر ہوتا جا رہا تھا۔ ایک دن ویران پارک کی اسی پرانی بینچ پر بیٹھ کر انہوں نے حساب لگایا کہ اس شہر میں اب ان کے صرف چار دوست باقی رہ گئے ہیں اور انہوں نے اچانک فیصلہ کیا کہ اب مرنے میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہئے کیونکہ ان کے جنازے کو کاندھا دینے کے لئے کم سے کم چار آدمیوں کا ہونا تو ضروری ہے۔ کہنے کو ان کے ان کے دو جوان بیٹے بھی تھے لیکن مرحوم کا خیال تھا کہ دوستوں کے کندھے پر

دوست کی لاش کا بوجھ بیٹوں کے کندھوں پر باپ کی لاش کے بوجھ سے کہیں زیادہ ہلکا محسوس ہوتا ہے۔ ناپ تول کا یہ نیا پیمانہ بھی ان کا اپنا تھا۔ مرنے سے دو دن پہلے یہی سوچ کر ویران پارک سے جلدی گھر واپس آ گئے۔ ان کی بیوی پریشان ہوگئی کہ کہیں ان کی طبیعت تو خراب نہیں ہوگئی ہے۔ بولے اب تو طبیعت کے سنبھلنے کی باری آ گئی ہے۔ اس رات انہوں نے فرمائش کر کے اپنی بیوی سے بیگن کا بھرتہ بنوایا جسے وہ بہت شوق سے کھاتے تھے۔ دوسرے دن وہ بہت دیر تک اپنے ہی گھر میں سوتے رہے۔ گھر والوں کے لئے یہ انوکھی بات تھی۔ شام کو وہ اپنے ان چار دوستوں سے ملنے کے لئے چلے گئے۔ ان سب کو تاکید کی کہ وہ دوسرے دن صبح میں ان کے گھر ضرور آ جائیں۔ دوستوں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ ایک ضروری کام ہے جس کے لئے ان کا آنا اور بھی ضروری ہے۔ دوسرے دن بھی وہ رات کو جلدی گھر واپس آ گئے۔ ان کی بیوی نے بھرتے کے بارے میں پوچھا تو بولے، آج خواہش نہیں ہے۔ آدھی رات کو اچانک وہ نیند سے جاگ گئے اور بتی جلا کر کتابوں کی الماری میں کچھ ڈھونڈنے لگے۔ ایک ایک کتاب کھول کر دیکھتے جاتے تھے۔ بیوی نے پوچھا، اتنی رات کو کیا ڈھونڈھ رہے ہو؟ ہنس کر بولے، مجھے یاد پڑتا ہے کہ بیس برس پہلے میں نے تم سے چھپا کر ایک ہزار روپئے کے کرنسی نوٹ اس الماری کی کسی کتاب میں رکھ دئے تھے۔ انہیں ڈھونڈھ رہا ہوں۔

بیوی نے کہا، صبح کو ڈھونڈ لینا، ایسی بھی کیا جلدی ہے۔

بولے، بیس برس کے بعد تو اب یہ بات یاد آئی ہے۔ اب بھول جاؤں گا تو پھر اس کے یاد آنے میں بیس برس اور لگ جائیں گے۔

آخر کار ایک کتاب میں سے سچ مچ ایک ہزار روپئے کے کرنسی نوٹ نکل آئے تو بہت خوش ہوئے۔ ان نوٹوں کو اپنی بیگم کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بولے، اب یاد آیا، بیس برس پہلے جاپان جاتے ہوئے ایرپورٹ جانے سے پہلے میں نے یہ ہندوستانی کرنسی اس کتاب میں چھپا دی تھی۔ اسے اب اپنے پاس رکھو، شاید تمہارے کسی کام آ جائے۔

> جتنے بھی گرہیں اس فن کے مجتبیٰ حسین ان سب سے واقف ہیں اور ان حربوں کو وہ نہایت سہولت سے فطری طور پر برتتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو وہ Born Humourist ہیں۔ طنز و مزاح کی جان تعریف ہے اور یہی حربہ مجتبیٰ حسین کے فن میں مرکزیت رکھتا ہے۔ تعریف کے فن کو جس خوبی سے مجتبیٰ برتتے ہیں وہ دیکھے سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر اس طرح سے پرتیں کھول کر لفظوں کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے آرٹ میں اس سے کیا کیا کام لیا جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین مبالغے کو کس طرح برتتے ہیں۔ تقابل کو کس طرح برتتے ہیں، غیر متناسب اشیاء یا عوامل کو کس طرح لاتے ہیں، نیز زبان سے مزاح کس طرح پیدا کرتے ہیں۔ یہ سب دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مجتبیٰ حسین صورت حال سے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں اور طنز خصوصاً سماجی طنز کی آمیزش سے بھی لطف بیان کا سماں باندھتے ہیں۔
>
> **(پروفیسر گوپی چند نارنگ)**

یہ کہہ کر وہ گہری نیند سو گئے۔ دوسرے دن صبح میں وہ پھر دیر تک اپنے ہی گھر میں سوتے رہے۔ آخر کار ان کے چار دوست وقت مقررہ پر ان کے بتائے ہوئے ضروری کام کے سلسلے میں آئے تو بچوں نے انہیں جگانے کا فیصلہ کیا۔ بچوں نے انہیں بہت جگایا مگر مرحوم جاگنے پر راضی نہ ہوئے۔ جاگ کر بھی کیا کرتے، اب دنیا میں ان کے لئے کوئی کام بھی تو باقی نہیں رہ گیا تھا۔ لتا منگیشکر کا گانا وہ سن چکے تھے۔ غالب اور شیکسپیئر کو پڑھ چکے تھے۔ بڑے غلام علی خاں اور بھیم سین جوشی کو بھی نپٹا چکے تھے اور تو اور انہیں وہ ایک ہزار روپئے بھی واپس مل گئے تھے جنہیں وہ ایک کتاب میں رکھ کر بھول چکے تھے، بھلا اور جی کر کیا کرتے۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مرحوم دوسری دنیا میں کس حال میں ہیں لیکن ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اگر جنت میں ہیں تو ضرور حوروں کے جھرمٹ میں ہوں گے اور اپنے آپ کو اسی طرح بنا رہے ہوں گے جس طرح انہیں بنانا چاہتی ہوں گی اور اگر خدا نہ کرے دوزخ میں ہیں تو اپنے جسم کو بڑے جتن کے ساتھ دہکتے انگاروں پر اس طرح جلوا رہے ہوں گے کہ کوئی حصہ جلنے سے باقی نہ رہ جائے۔ مرحوم نے زندگی میں جو بھی کام کیا وہ سچی لگن کے ساتھ کیا۔ مرنے کے بعد وہ بھلا اپنی عادتوں کو کیا بھول پائیں گے۔ پھر دوزخ میں ان کے لئے خوشی کی بات یہ بھی ہوگی کہ ان کے بہت سے دوست جو انہیں اس دنیا میں چھوڑ کر چلے گئے تھے وہیں موجود ہوں گے۔ نیچے کی دنیا میں اچھی صحبت میں نہ رہنے کا فائدہ دوسری دنیا میں دوزخ میں پہنچ کر ہی ملتا ہے۔

دلچسپ بات یہ بھی تھی کہ ان کے مرنے سے ادب میں کوئی خلا پیدا نہیں ہوا کیونکہ مرحوم کا دعویٰ تھا کہ لوگ مر کر ادب میں خلا پیدا کرتے ہیں لیکن انہوں نے زندہ رہ کر ادب میں لگاتار خلا پیدا کیا تھا۔ ان کی زندگی اور ان کے ادب کی یہی بڑائی ہے۔

آخری عمر میں وہ اپنے عزیز دوست شہریار کا یہ شعر اکثر گنگناتے تھے:

زندگی جیسی تھی، اس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے

❑❑❑

غزل سپلائنگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی پرائیویٹ اَن لمیٹیڈ

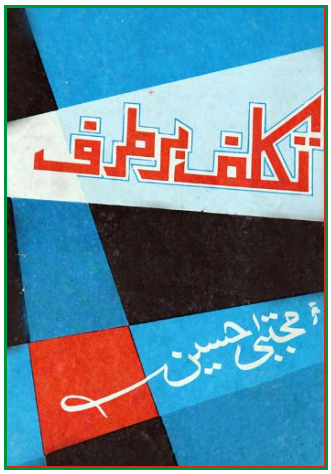

ادھر جب سے دنیا تجارت کے چنگل میں پھنس گئی ہے۔اس وقت سے ہر شئے ترازو میں تلنے اور تجارت کے سانچے میں ڈھلنے لگی ہے۔ہمیں اس نوجوان کی بات اب بھی یاد ہے جس نے ایک کتب فروش کی دکان پر کھڑے ہوکر کتب فروش سے کہا تھا: 'جنابِ والا! مجھے کرشن چندر کے دوکلو افسانے، راجندر سنگھ بیدی کے ڈیڑھ کلو کہانیاں اور فیضؔ کی چار کلو غزلیں دیجئے۔'

اس پر کتب فروش نے ہماری آنکھوں کے سامنے کرشن چندر اور بیدی کی کہانیوں کے مجموعے ترازو میں تول کر دیئے اور فیضؔ کی غزلوں کے بارے میں فرمایا: ''حضور والا! میں آپ کو فیض احمد فیضؔ کی غزلیں دینے کے موقف میں نہیں ہوں کیونکہ فیضؔ کا سارا ادبی سرمایہ دو کلو غزلوں پر مشتمل ہے۔یقین نہ آئے تو 'دستِ صبا'، 'نقشِ فریادی' اور 'زنداں نامہ' کو تول کر دیکھ لیجئے۔'

اس دن سے ہمیں یہ یقین ہو چلا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب تجارت، ادب پر اس قدر غالب آجائے گی کہ لوگ شاعری کی بلیک مارکیٹنگ اور افسانوں کی ذخیرہ اندوزی کرنے لگیں گے (ویسے بیرونی ادب کی اسمگلنگ تو ہمارے ہاں اب بھی جاری ہے) مگر ہمارا یقین اُس وقت پختہ ہوا جب ہمیں پتہ چلا کہ ایک صاحب نے 'غزل سپلائنگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی پرائیویٹ ان لمیٹیڈ' قائم کر رکھی ہے اور اس کمپنی کا کاروبار زوروں پر جاری ہے۔ چنانچہ ہم اس کمپنی کا معائنہ کرنے کی غرض سے اس مقام پر پہنچے تو دیکھا کہ لوگ قطار باندھے کھڑے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں کورے کاغذات ہیں۔ ہم نے ان لوگوں سے پوچھا: 'صاحبو! آپ لوگ کون ہیں، یہاں کیوں کھڑے ہیں اور آپ نے ہاتھوں میں کورے کاغذات کیوں پکڑ رکھے ہیں؟'

اس پر ایک نازک اندام نوجوان، جس کے بال بڑھے ہوئے تھے، آگے بڑھا اور بولا: 'جناب والا! ہم ماڈرن شاعر ہیں اور فکرِ شعر میں وقت برباد نہیں کرتے، اس لئے ریڈی میڈ غزلیں خریدنے آئے ہیں اور ہمارے ہاتھوں میں کورے کاغذات اس لئے ہیں کہ ہم ان پر غزلیں لکھوا کر لے جائیں گے۔'

نوجوان کا یہ جواب سن کر ہم آگے بڑھنے لگے تو قطار میں ایک شور بلند ہوا: 'صاحب! قطار میں ٹھہریئے، ہم تو صبح سے یہاں کھڑے ہیں۔آپ دیر سے آئے ہیں اس لئے آپ کو قطار میں سب سے پیچھے ٹھہرنا چاہئے۔'

ہم نے شعراء کی ہوٹنگ کا کوئی نوٹس نہ لیا اور کمپنی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئے۔ ایک کمرے میں ہمیں اس کمپنی کے پروپرائٹر مسٹر عبدالرحیم وفاؔ نظر آئے جو ہاتھ میں قینچی پکڑے ایک غزل کو کاٹ رہے تھے۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا تو بولے: 'مکرّر مکرّر'۔ ہم نے اپنا دوبارہ تعارف کرایا تو وہ بے حد خوش ہوئے اور بولے: 'معاف کیجئے، میں ذرا اونچا سنتا ہوں، اسی لئے آپ کو اپنا تعارف مکرر کروانا پڑا'۔ پھر بولے: 'میں آپ کو اپنی کمپنی کا معائنہ ضرور کراؤں گا۔ مگر آپ کو پانچ منٹ تک انتظار کی زحمت برداشت کرنی ہوگی کیونکہ اس وقت میں ایک غزل کو کاٹ رہا ہوں'۔ پھر جب وہ قینچی لے کر دوبارہ غزل کو کاٹنے میں مصروف ہوگئے تو ہم نے ازراہ تجسس ان سے پوچھا:

'قبلہ! آپ قینچی سے اس غزل کو کیوں کاٹ رہے ہیں؟'

وہ مسکراتے ہوئے بولے: 'بھئی! بات دراصل یہ ہے کہ یہ غزل بڑی بحر میں لکھی گئی ہے اور اب میں اسے کاٹ کر اس میں سے چھوٹی بحر کی دو غزلیں برآمد کروں گا کیونکہ میرے پاس وقت بہت کم ہے اور شعراء کے ڈھیروں آرڈرز میرے پاس پڑے ہوئے ہیں'۔

یہ کہہ کر انہوں نے غزل کاٹی اور نوکر کو بلا کر کہا: 'میاں! یہ غزلیں اسی وقت میوزک ڈائرکٹر کے پاس لے جاؤ اور کہو کہ شام تک ان دونوں غزلوں کا ترنم فٹ ہوجائے کیونکہ آج رات میں مشاعرہ ہے اور جناب ترنم روحانی اس مشاعرہ میں یہ غزلیں پڑھیں گے'۔

ہم نے پوچھا: 'یہ ترنم روحانی کون ہیں؟'

بولے: 'ہمارے بہت پرانے گاہک ہیں، آپ انہیں نہیں جانتے؟ یہ تو ہمارے ملک کے ممتاز شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں اور ہمیں فخر ہے کہ وہ گزشتہ بیس برسوں سے ہماری کمپنی سے غزلیں اور ان کا ترنم خرید رہے ہیں'۔

پھر جناب عبدالرحیم وفاؔ نے اپنی داستان الم انگیز یوں بیان کرنی شروع کردی:

'جناب والا! میں بچپن ہی سے اس نظریہ کا قائل ہوں کہ شعراء تین قسم کے ہوتے ہیں: ایک پیدائشی شاعر، دوسرا موروثی شاعر اور تیسرا نمائشی شاعر۔ پیدائشی شاعر تو وہ ہوتا ہے جو پیدا ہوتے ہی مطلع عرض کرتا ہے یعنی روتا بھی ہے تو علم عروض کے اصولوں کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اُس کے رونے میں بھی ایک ترنم پوشیدہ ہوتا ہے اور ابھی دس بارہ سال کا بھی

> حیدرآباد کو اپنے پورے جمال میں مجتبیٰ حسین کے ساتھ ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ دہلی میں حیدرآباد کی سفارت کا کام مجتبیٰ کرتے ہیں۔ حسینی صاحب اور مجتبیٰ جب مخصوص حیدرآبادی لہجے میں حیدرآباد سے آنے اور حیدرآباد کو جانے والے اشخاص کا ذکر کرتے ہیں تو بڑا اچھا لگتا ہے۔
>
> مجتبیٰ میں اختراعی قوت بے پناہ ہے۔ جو اس وقت کی زد میں آیا، رسوا ہوا۔ وہ ذرا سی بلکہ معمولی سی بات میں ایسی نمک مرچ لگاتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔
>
> (شہریار)

ہونے نہیں پاتا کہ 'صاحب دیوان' بن جاتا ہے۔ موروثی شاعر وہ ہوتا ہے جسے شاعری ورثے میں ملتی ہے یعنی اصل میں اس کا باپ شاعر ہوتا ہے اور جب وہ مرتا ہے تو اپنے پیچھے قرض خواہوں کے علاوہ غیر مطبوعہ غزلیں اور نظمیں چھوڑ جاتا ہے۔ پس اس کا بیٹا ان غزلوں اور نظموں کو وقفہ وقفہ سے رسائل میں چھپواتا ہے اور موروثی شاعر ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے۔ لیکن شاعروں کی ایک تیسری قسم بھی ہوتی ہے جو نمائشی شاعر کہلاتی ہے۔ سچ پوچھئے تو ان دنوں ہر طرف نمائشی شعراء کی بھرمار ہے جو کہیں سے غزلیں سہ غزلیں لکھوا کر لاتے ہیں انہیں مشاعروں میں پڑھ کر نام کماتے ہیں۔ چونکہ میں ابتداء ہی سے پیدائشی شاعر رہا ہوں اس لئے میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ بڑا ہوکر ایک ایسی کمپنی قائم کروں گا جہاں سے نمائشی شعراء کو سستے داموں پر غزلیں اور نظمیں فراہم کی جائیں۔ چنانچہ میں نے نہایت قلیل سرمائے سے کمپنی کا آغاز کیا۔ میں نے ایک سکنڈ ہینڈ قلم اور ایک سکنڈ ہینڈ دوات خریدی اور مستقبل کی طرف روانہ ہوگیا۔ ابتدا میں میرا طریقۂ کار یہ تھا کہ میں اپنے ہاتھ میں قلم پکڑ کر گلی گلی آوازیں لگاتا پھرتا کہ 'غزل لکھوایئے، نظم کی اصلاح کروایئے'۔ وہ دن میرے لئے سخت آزمائش کے تھے۔ جب ہر طرف 'پیدائشی شاعر' نظر آیا کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ نمائشی شعراء بھی نمودار ہونے لگے اور میرا کاروبار چل پڑا۔ جب میری حالت ذرا سنبھلی تو میں نے ایک ٹھیلا خریدا اور اس ٹھیلے میں غزلیں، نظمیں، سہرے اور رباعیاں رکھ کر فروخت کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ میری گمنامی دور دور تک جا پہنچی اور لوگ دور دور سے غزلیں لکھوانے کے لئے آنے لگے۔ میرا نصیب جاگ اٹھا اور میں اتنا مالدار ہوگیا کہ آج 'غزل سپلائینگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی' کا پروپرائٹر ہوں۔ اب میں نے چار پیدائشی شعرا کی خدمات بھی حاصل کرلی ہیں جو دن رات غزلیں، نظمیں، رباعیاں اور قطعات لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے ایک میوزک ڈائرکٹر کی خدمات بھی حاصل کرلی ہیں جو مختلف غزلوں کا ترنم فٹ کرتا ہے۔ پھر میں نے اپنی کمپنی میں ایک نیا شعبہ بھی قائم کیا ہے جسے 'شعبۂ سامعین' کا نام دیا گیا ہے۔ اس شعبے کے ذمہ یہ کام ہے کہ وہ مشاعروں میں سامعین کو روانہ کرے اور کمپنی کی فراہم کردہ غزلوں پر کچھ ایسی داد دے کہ اچھے خاصے نمائشی شاعر پر 'پیدائشی شاعر' کا گمان ہونے لگ جائے۔ چنانچہ میں فی سامع سواری خرچ کے علاوہ دو روپے چارج کرتا ہوں۔ میرا یہ شعبہ بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کررہا ہے کیونکہ

مشاعرے زیادہ تر راتوں ہی میں منعقد ہوتے ہیں۔ ہمارے سامعین کسی شاعر کے کلام پر اِس زور وشور سے داد دیتے ہیں کہ خود بے چارے شاعر کا کلام کوئی سننے نہیں پاتا۔ اب میں نے ایک 'شعبہ ہوٹنگ' بھی قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے تا کہ کمپنی کے مخالفین کے دانت کھٹے کئے جائیں۔'

مسٹر عبدالرحیم وفاؔ ابھی اپنی داستان بیان ہی کر رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی اور وہ ریسیور اُٹھا کر کہنے لگے: 'ہیلو! کون...؟ اچھا! شاداؔنی صاحب بات کررہے ہیں۔؟'

'جی ہاں...! مجھے معلوم ہے کہ مشاعرہ آج رات میں ہے لیکن میں مجبور ہوں کیونکہ آپ نے ابھی تک دو پرانی غزلوں کی قیمت ادا نہیں کی۔ جب تک پچھلا حساب صاف نہ ہوجائے میں آپ کے لئے ایک شعر بھی نہیں کہہ سکتا۔'

'کیا کہا! مشاعرہ میں آپ کو معاوضہ ملنے والا ہے، یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ آپ کو مشاعرہ میں معاوضہ ملتا ہے، گزشتہ بار بھی آپ کو معاوضہ ملا تھا، لیکن آپ نے میری غزلوں کی اُجرت ادا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ آپ مجھ سے پانچ روپے میں ایک غزل لے جاتے ہیں اور اسے مشاعرہ میں پڑھ کر پچیس تیس روپے معاوضہ حاصل کرلیتے ہیں۔ میں کبھی یہ برداشت نہیں کروں گا کہ آپ میری شاعری کے علاوہ میری محنت کا بھی استحصال کریں۔'

اس کے بعد ٹیلیفون پر طویل وقفہ رہا اور شاداؔنی صاحب دوسری طرف سے مسلسل بولتے رہے۔ اور آخر میں وفاؔ صاحب جھنجھلاتے ہوئے بولے: 'دیکھئے، شاداؔنی صاحب، میں آپ کو غزل ضرور لکھ دیتا، لیکن میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے کیونکہ مجھے خود صدرِ مشاعرہ کی غزلیں کہنی ہیں۔ بہتر ہے کہ آج آپ مشاعرہ میں نہ جائیں۔' اس کے بعد وفاؔ صاحب نے بڑے زور سے ریسیور رکھ دیا اور بولے: 'بدتمیز کہیں کے، جب غزل لکھوانی ہوتی ہے تو یوں منت سماجت کرتے ہیں جیسے کوئی فقیر بھیک مانگ رہا ہو لیکن جب مشاعرے میں میری ہی غزل میرے سامنے پڑھتے ہیں تو میری طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے اپنی ذاتی غزل سنا رہے ہوں۔'

پھر وفا صاحب نے اپنے حواس درست کئے اور کہا: 'میں آپ کو اپنی کمپنی کی داستان تو سنا چکا ہوں، اب آپ میرے پراسپکٹس کا مطالعہ فرمائیے جس سے آپ کو میری کمپنی کی جملہ تفصیلات کا علم ہوجائے گا۔' یہ کہتے ہوئے انہوں نے پراسپکٹس ہمارے سامنے پھینک دیا۔ ہم نے موقع کو غنیمت جانا اور ایک پراسپکٹس اپنے ساتھ لے آئے جسے من وعن ہم یہاں نقل کررہے ہیں:

غزل سپلائنگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی پرائیوٹ لمیٹیڈ پراسپکٹس

- گاہکوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے تخلص کا خود انتخاب کریں۔ ایک بار آپ نے تخلص رکھ لیا تو آپ کو مکمل شاعر بنانے کی ذمہ داری کمپنی پر عائد ہوگی۔
- بیک وقت چار غزلوں کا آرڈر دینے پر ایک قطعہ مفت فراہم کیا جائے گا۔
- اگر کمپنی کی فراہم کردہ کسی غزل پر مشاعرہ میں ہوٹنگ ہو تو اس کی ذمہ داری کمپنی پر عائد نہیں ہوگی۔ ہم غزل کو ہوٹنگ سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری صرف اسی صورت میں قبول کرسکتے ہیں جب آپ ہمارے 'شعبۂ سامعین' کی خدمات سے استفادہ کریں۔
- غزلوں کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے کی ذمہ داری بھی متعلقہ شعراء پر عائد ہوگی۔ کیونکہ کمپنی صرف شعر کہتی ہے، شعراء کو 'قاعدہ' نہیں پڑھا سکتی۔
- بڑی بحر کی غزل کے پانچ اشعار کی قیمت دس روپے اور چھوٹی بحر کی غزل کی پانچ روپے ہوگی۔ اگر کوئی صاحب صرف ایک مصرعہ خریدنا چاہتے ہوں تو ان سے پورے شعر کی اُجرت وصول کی جائیگی۔
- اگر کوئی صاحب کمپنی ہذا سے آزاد نظمیں لکھوانا چاہتے ہوں تو انہیں اپنی دماغی صحت کے بارے میں سب سے پہلے طبی صداقت نامہ پیش کرنا ہوگا۔
- اگر کوئی صاحب 'سہرا' لکھوانا چاہتے ہوں تو واضح ہو کہ کمپنی سہرا نگاری کی بھاری اُجرت وصول کرتی ہے کیونکہ دوسروں کی شادی پر خوشی کا اظہار کرنا ایک بہت بڑی آزمائش ہے۔
- کمپنی ہذا نے گاہکوں کے لئے غزلیں کرایہ پر دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ لیکن کوئی غزل چوبیس گھنٹوں سے زیادہ عرصہ کے لئے اپنے پاس نہ رکھی جائے کیونکہ جب سائیکلیں کرایہ پر دی جاتی ہیں تو انہیں بھی اسی شرط کے ساتھ کرایہ پر دیا جاتا ہے۔
- گاہکوں کو غزلوں کی قیمت نقد ادا کرنی ہوگی کیونکہ شعراء کو ادھار غزلیں دینا، دنیا کی سب سے بڑی غلطی ہے۔
- ہم نے گاہکوں کی سہولت کی خاطر پرانی غزلوں کی ریپیرنگ کا بھی بندوبست کیا ہے لیکن یہ غزلیں اتنی پرانی، بوسیدہ اور شکستہ بھی نہیں ہونی چاہیے کہ ان کی ریپیرنگ پر نئی غزل کی لاگت آجائے۔
- ایک بار فروخت کی ہوئی غزلیں واپس نہیں لی جائیں گی۔ البتہ مستعمل غزلیں نصف قیمت پر خریدی جائیں گی۔

ہم نے کمپنی کے پراسپکٹس کو بغور پڑھا اور مسٹر عبدالرحیم وفاؔ سے اجازت لے کر واپس آگئے۔ اب ہم عوام کی اطلاع کے لئے اسے شائع کررہے ہیں تا کہ جو کوئی بھی صاحب خواہ مخواہ شاعر بننے کی تمنا رکھتے ہوں وہ شاعری کی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھولیں اور یوں سارے پانی کو گندہ کردیں۔

❑❑❑

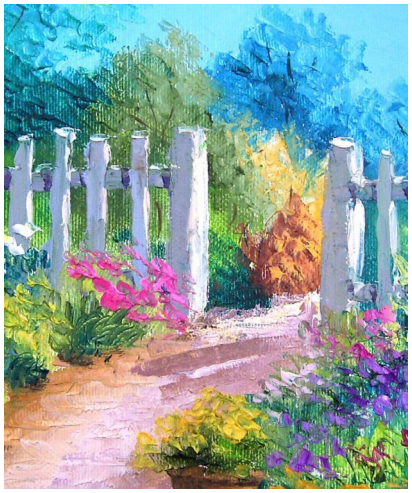

مشاعرے اور مجرے کا فرق

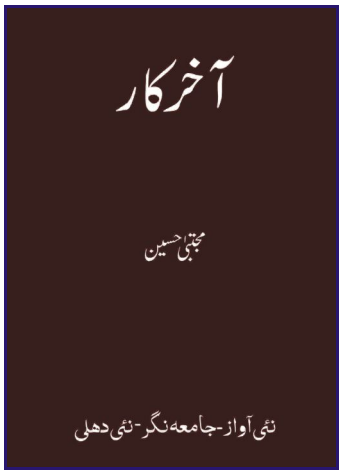

دہلی کے ایک ہفتہ وار رسالہ نے اردو مشاعروں کے زوال پر مختلف شاعروں اور دانشوروں کے بیانات کو شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔اس کے تازہ شمارہ میں اردو کے بزرگ شاعر حضرت خمار بارہ بنکوی کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے مشاعرہ کے زوال کے دیگر اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے آج کے دور کی شاعرات کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ''آج کی شاعرات نے مشاعرہ کو مجرا بنا دیا ہے۔ پہلے میں مشاعرہ میں جاتا تھا تو عمر بڑھتی تھی۔مگر اب مشاعروں میں جانے سے عمر گھٹنے لگی ہے۔''

حضرت خمار بارہ بنکوی ماشاءاللہ اب اسی (82) کے پیٹے میں ہیں۔اور پچھلے ساٹھ برسوں سے ملک کے مشاعروں میں حصہ لے رہے ہیں۔ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ جتنے مشاعرے انہوں نے پڑھے ہیں، اتنی تو کتابیں بھی ہم نے نہ پڑھی ہوں گی۔اپنی عمر، تجربہ اور علم کے اعتبار سے ان کا شمار ہمارے بزرگوں میں ہوتا ہے۔اور وہ ہمارے پسندیدہ شاعروں میں سے ہیں۔لیکن کبھی کبھی حالات ایسے پیدا ہوجاتے ہیں کہ بزرگوں سے اختلاف کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔سرظفراللہ خان نے ایک بار پطرس بخاری سے پوچھا 'بتایئے کے طنبورے اور تان پورے میں کیا فرق ہوتا ہے؟' اس پر پطرس بخاری نے سرظفراللہ خاں سے پوچھا 'حضور! یہ بتایئے کہ اب آپ کی عمر کیا ہے؟' سرظفراللہ خاں بولے: 'پچہتر برس کا ہو چکا ہوں۔' یہ سن کر پطرس بخاری نے نہایت اطمینان سے کہا: 'حضور! جب آپ نے اپنی زندگی کے پچہتر برس طنبورے اور تان پورے کا فرق جانے بغیر گذار دیئے تو پانچ دس برس اور صبر کر لیجئے۔ایسی بھی کیا جلدی ہے۔' خمار بارہ بنکوی نے اب جو یہ کہا ہے کہ موجودہ دور کی شاعرات نے مشاعرے اور مجرے کے فرق کو ختم کر دیا ہے اور یہ کہ مشاعروں میں شرکت کرنے سے اب ان کی عمر گھٹنے لگی ہے تو اس سلسلہ میں ہماری دست بستہ عرض یہ ہے کہ وہ ایسی غیر ضروری باتوں پر غور کر کے اپنی عمر کو مزید گھٹنے نہ دیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ وہ اپنی عمر کو بڑھانے کی آس میں مشاعروں میں شرکت کرتے رہیں۔ مانا کہ خمار بارہ بنکوی ہمارے بزرگ ہیں لیکن ہم ان کے اس بیان سے اتفاق نہیں کرتے کہ آج کی شاعرات نے مشاعرے اور مجرے کے فرق کو ختم کر دیا ہے کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ مشاعرے اور مجرے میں اب بھی ایک واضح فرق موجود ہے۔وہ اس طرح کہ

مجرے میں طوائفیں اس طرح بن سنور کر اور سج دھج کر پیش نہیں ہوتیں جیسی ہماری خاتون شعراء مشاعروں میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔

ماشاءاللہ ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے اور ہم عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں ہم اپنی عمر کے ہندسے کاغذ پر لکھتے ہیں تو یہ ہندسے تک ایک دوسرے سے منھ موڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری عمراب خدا کے فضل سے ۶۲ برس کی ہو چکی ہے اور ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ ۲ اور ۶ کے ہندسوں میں کیسی ان بن پیدا ہو چکی ہے کہ ایک کا منھ مغرب کی طرف تو دوسرے کا مشرق کی طرف۔ عمر کی یہ وہ منزل ہوتی ہے جہاں آدمی نہ صرف اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگتا ہے بلکہ اپنے گناہوں کا اعتراف بھی کر لیتا ہے۔ خمار صاحب نے ہوسکتا صرف مشاعروں میں شرکت کی ہو لیکن ہم نے اپنی زندگی میں (جو خمار صاحب کی عمر کے لحاظ سے مختصر ہی کہلائیگی) مشاعروں اور مجروں دونوں میں شرکت کی ہے بلکہ ایک مجرے والی کے گھر پر مشاعروں کی صدارت بھی کی ہے۔ جوانی میں آدمی کیا نہیں کرتا۔ یہ 1968 کی بات ہے۔ اب آپ سے کیا چھپائیں کہ اس مجرے والی کے ہاں، جو ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتی تھی مشاعرہ رات میں دس بجے مقرر ہوتا تھا تو ہم آٹھ بجے ہی مشاعرہ کی صدارت کرنے کے لئے پہنچ جاتے تھے۔ مشاعرہ تو رات کے بارہ بجے برخواست ہوجاتا تھا لیکن ہماری صدارت بسا اوقات رات میں دو بجے تک جاری رہتی تھی۔ سامعین کے لئے شطرنجیاں بعد میں بچھتی تھیں، پہلے مسند صدارت بچھائی جاتی تھی جو سب سے آخر میں اٹھائی جاتی تھی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ان مشاعروں میں بھی ہم نے ہمیشہ شعر ہی سنے۔ کبھی مجرا نہیں دیکھا جبکہ آج کے مشاعروں میں ہم بعض خاتون شعراء کی عنایت سے مشاعرہ کم سنتے ہیں اور مجرا زیادہ دیکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہم نے مجرے والیوں کو کبھی اتنا بے باک (بلکہ بے باق)، بے حیا، بے شرم مگر ساتھ ہی ساتھ ایسا بے پناہ نہیں پایا جیسا کہ مشاعروں میں ہماری بعض شاعرات نظر آتی ہیں۔ خدا کی قسم مجرے والیاں تو بے حد شریف، پاکباز اور حیادار ہوتی ہیں۔ ان بیچاری شریف بیبیوں کو تو اپنے گانے بجانے سے مطلب ہوتا ہے جب کہ بعض شاعرات کی شاعری میں شاعری کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی کہ 'ماورائے شاعری' کی ہوتی ہے۔ ان کا سارا دارومدار 'ماورائے شاعری' پر ہی ہوتا ہے۔ ہمارے ایک ندیدے دوست ہیں جنہوں نے پانچ چھ برس پہلے ایک مشاعرہ میں ایسی ہی کسی 'ماورائے شاعری شاعرہ' کو سننے کے بعد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہم سے کہا تھا 'بخدا! کیا شعر کہتی ہے کہ بس دیکھتے رہ جایئے۔' ہم نے کہا 'مگر شعر کا تعلق دیکھنے سے نہیں سننے سے ہوتا ہے۔' بولے 'مگر اس شاعرہ کا یہی تو کمال ہے کہ اس کے شعر سننے کے نہیں دیکھنے کے ہوتے ہیں۔ بالکل ہاتھی

ایک دن جب میں خدا کی اس پالیسی پر غور کر رہا تھا کہ اس نے بدصورت انسان کیوں پیدا کئے اور میرے علاوہ کس کس کو بدصورت پیدا کیا ہے کہ میری اکلوتی بیٹی نے جو میری بدصورتی کو بھی پتی برت کا ایک حصہ مانتی ہے، مجھے ڈاک سے آیا ہوا ایک لفافہ لا کر دیا۔ وہ میری ڈاک میں آئے ہوئے ہر لفافے کو اپنے بھائی کا لفافہ سمجھتی ہے اور کوئی لفافہ اگر واقعی اس کے بھائی کا نکل آئے تو مجھے بوسہ دینے پر بھی آمادہ ہوجاتی ہے۔

میں نے لفافہ کھولا اور کہا: سوری میڈم! یہ تو کسی مجتبیٰ حسین نامی شخص کا ہے۔

وہ بولی: جبھی اتنا بدصورت خط ہے اور وہ منھ بنا کر بغیر بوسہ عطا کئے چلی گئی۔ میرے کئی بوسے اسی طرح ملتوی ہو چکے ہیں۔ خدا ہر بوسے کو ہر مجتبیٰ حسین سے بچائے۔

خط پڑھ کر فوری تاثر یہ ہوا کہ ان صاحب کا ہینڈ رائٹنگ تو میری صورت سے بھی بھدا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ مجھ سے بھی زیادہ بدصورت اس دنیا میں موجود ہیں۔ خط اتنا بدشکل تھا کہ مشکل سے پڑھا اور اس سے بھی مشکل سے سمجھا جاتا تھا۔ میں نے سوچا، اگر ایسا بدشکل خط لکھنے والا خود بھی بدصورت نکلا تو اللہ کے فضل وکرم کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔

دو برس بعد جب دہلی میں مجتبیٰ حسین سے پہلی ملاقات ہوئی تو اس کے منھ سے واقعی جو پہلا لفظ نکلا وہ تھا 'فکر بھائی'

'فکر بھائی کی حد تک کہنے میں تو کوئی برائی نہیں تھی لیکن اس کے خد و خال دیکھ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ کیونکہ وہ کمبخت اتنا بدصورت نہیں تھا جتنا میرا بھائی بننے کے لئے اسے ہونا چاہئے تھا اور پھر وہ اس دوران میں مجھے اتنے پیارے پیارے خط لکھ چکا تھا کہ میرے ذہن میں اس کی ہینڈ رائٹنگ کی بدصورتی غائب ہو چکی تھی اور وہ حسن ابھر آیا تھا جو ہینڈ رائٹنگ کے اندر چھپا ہوا تھا۔

عرف عام میں اسے روح کا حسن کہتے ہیں لہٰذا میں نے روح کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا 'مجتبیٰ بھائی'

اور یوں مجتبیٰ بھائی فکر بھائی وجود میں آ گئے اور ہم دونوں کی بدصورتیوں پر پانی پھر گیا۔ ہر بدصورتی کی یہی ٹریجڈی ہے کہ جب عشق درمیان میں آجائے تو بدصورتی کا انجام اس خدا کی طرح ہوجاتا ہے کہ:

'ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے'

ویسے دل ہی میں میں نے یہ شکایت ضرور کی 'مجتبیٰ! مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی'

(فکر تونسوی)

کے دانتوں والا معاملہ ہے۔ بہرہ آدمی بھی اس کے کلام کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ شاعری ہو تو ایسی۔ بعضے شعر تو ایسے نکالتی ہے کہ بلا مبالغہ شعروں سے لپٹ جانے اور انہیں اپنی بانہوں میں سمیٹ لینے کو جی چاہے۔ اردو میں آج تک کسی نے ایسے شعر نہیں کہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے شعروں سے کما حقہ لطف اندوز ہونے کے لئے آنکھوں کا زیادہ سے زیادہ اور کانوں کا کم سے کم استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کی شاعری کانوں سے سنی جائے تو ہوسکتا ہے کہ بعض مصرعے بحر سے خارج نظر آئیں، وزن بھی کہیں کہیں گر رہا ہو۔ لیکن اگر آپ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھیں تو واللہ وہ سراپا پابند بحر نظر آتی ہے۔ وزن میں ایسی جکڑی ہوئی اور تنی ہوئی ہے کہ خود دیکھنے والے کا وزن گر گر جائے اور سنبھالے نہ سنبھلے۔ وہ ترنم سے کلام نہیں سناتی بلکہ کلام سے ترنم سناتی ہے۔ صرف وہ ہی نہیں بولتی بلکہ اس کا انگ انگ بولتا ہے۔ شعر اس کے سالم بدن میں مچلنے اور تھرکنے، ٹھمکنے اور ہمکنے لگتا ہے اور شعر کا مطلب اس کے پورے سیاق وسباق کے ساتھ اس کی خمار آلودہ آنکھوں میں یوں چھلکنے لگتا ہے کہ دیکھنے والا آنکھ مارے بنا نہیں رہ سکتا۔ ہائے ہائے ظالم شعر سناتی ہے تو لگتا ہے کہ خود سراپا غزل بن گئی ہے۔'

الغرض ہمارے ندیدے دوست نے اُس شاعرہ کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں کہی تھیں لیکن ہم انہیں یہاں مزید اس لئے بیان نہیں کریں گے کہ انہیں لکھنے میں بیٹھے ہیں تو خود ہماری طبیعت کے مچلنے اور بہکنے کے آثار نمودار ہونے لگے ہیں۔ اس لئے اپنے ندیدے دوست کے بیان کو ہم یہاں ختم کرتے ہیں۔

ابھی پچھلے مہینہ ہمارے دوست اور اردو کے بہی خواہ پروفیسر ستیہ پال آنند نے ہمیں امریکہ سے خط لکھا تھا، جس میں ایک مشاعرہ کی روداد بیان کی گئی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ امریکہ کے ایک مشاعرہ میں ایسی ہی ایک شاعرہ جب کلام سنانے لگی تو ایک سامع کو جو حاضرین میں بیٹھا ہوا تھا اس کا کوئی شعر اتنا پسند آیا کہ اس نے اظہار پسندیدگی کے طور پر محفل میں بیٹھے بیٹھے ہی شاعرہ کو دور ہی سے دس ڈالر کا کرنسی نوٹ دکھایا۔ اس پر شاعرہ ڈائس سے اتر کر خراماں خراماں دس ڈالر کو حاصل کرنے کی غرض سے کرنسی نوٹ کے پاس گئی۔ اسے حاصل کیا اور کرنسی نوٹ کو سینہ کے عین اوپر مگر بلاؤز کے اندر رکھتے ہوئے پھر سے وہی شعر سنانا شروع کر دیا۔ ذرا غور کیجئے کہ سامع نے 'مکرر ارشاد' کا کیا خوبصورت نعم البدل دریافت کیا ہے۔ سچ ہے امریکی ڈالر میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔

ہمیں اس وقت اپنی جوانی کے دنوں کے ایک صحافی دوست یاد آگئے جو ان دنوں سعودی عرب میں نہایت کامیاب اور شریفانہ زندگی گذار رہے ہیں۔ بالکل اسم بامسمیٰ بن گئے ہیں۔ جوانی کے دنوں میں انہیں ہمیشہ کوئی نہ کوئی نئی بات سوجھتی تھی۔ آج سے تیس پینتیس برس پہلے انہوں نے حیدرآباد کے رویندر بھارتی تھیٹر میں ایک ایسا مشاعرہ منعقد کیا تھا جس میں صرف خاتون شعراء نے شرکت کی تھی اور جس میں ان کے کہنے کے مطابق ملک بھر کی ممتاز خاتون شعراء شریک ہوئی تھیں۔ ہمیں اب بھی ان خاتون شعراء کے کچھ نام یاد ہیں جیسے ناز کانپوری، پونم کلکتوی، سلطانہ بارہ بنکوی، زیبا مرادآبادی، نجمہ ناگپوری، چترا بھوپالی وغیرہ۔ مشاعرہ سے پہلے اخباروں میں بطور تشہیر ان شاعرات کی جان لیوا تصویریں (جن کے تراشے پچھلے سال تک ہمارے پاس محفوظ تھے) کچھ ایسے اہتمام سے شائع ہوئیں کہ کئی ثقہ اور سنجیدہ حضرات نے بھی اس مشاعرہ میں شرکت کو ضروری سمجھا۔ ایسے حضرات میں ہم بھی شامل تھے۔ مشاعرہ کچھ اتنا کامیاب رہا کہ رویندر بھارتی تھیٹر کی چھتوں کا اڑنا باقی رہ گیا تھا۔ (چھتیں اس لئے بھی نہیں اڑیں کہ ان دنوں یہ تھیٹر نیا نیا بنا تھا اور مضبوط بھی تھا۔) مشاعرہ کے بعد ہم کسی وجہ سے کچھ دیر رک گئے اور جب باہر نکلے تو دیکھا کہ مشاعرہ گاہ کے باہر زیبا مرادآبادی، نجمہ ناگپوری، اور پونم کلکتوی ایک رکشا والے سے حیدرآباد کے ایک مخصوص محلہ تک چلنے کے لئے کرائے کے مسئلے پر تکرار کر رہی ہیں۔ سچ پوچھئے تو اس مشاعرہ میں ہمیں مشاعرہ کا ہی لطف آیا تھا مجرے کا نہیں۔ تیس پینتیس برس میں ہمارے ہاں مشاعرہ کی روایت اس مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں مجرا پیچھے رہ گیا ہے اور مشاعرہ آگے کو نکل گیا ہے۔ اس لئے کہ مجرے کے کچھ آداب ہوتے ہیں جن کا اب تک بھی پاس ولحاظ رکھا جاتا ہے لیکن مشاعرہ کے آداب جو کبھی ہوا کرتے تھے اب باقی نہیں رہے۔

حضرت خمار بارہ بنکوی سے ہمیں دلی ہمدردی ہے کہ ایسے مشاعروں میں جا کر ان کی عمر بڑھنے کے بجائے کم ہونے لگی ہے۔ ہم تو خیر کبھی بھی کسی مشاعرہ میں یہ سوچ کر نہیں گئے کہ یہاں جانے سے ہماری عمر بڑھے گی۔ اگر مشاعروں میں جانے سے عمر بڑھ سکتی تو علم طب نے آج اتنی ترقی نہ کی ہوتی۔ ہر کوئی ہسپتال جانے کے بجائے مشاعرہ میں بھرتی ہوجاتا۔ ہم تو خیر خود بھی شاعر نہیں ہیں اور نہ ہی شاعری سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں۔ بس کبھی کبھار بعض مخصوص شاعرات کو دیکھنے کے لئے مشاعروں میں چلے جاتے ہیں۔ ہمیں نہیں پتہ کہ اس سے ہماری عمر بڑھتی ہے یا گھٹتی ہے۔ لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو پھر سے جوان محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اب بھلا بتایئے اس عمر میں یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے۔

❑❑❑

دیمکوں کی ملکہ سے ملاقات

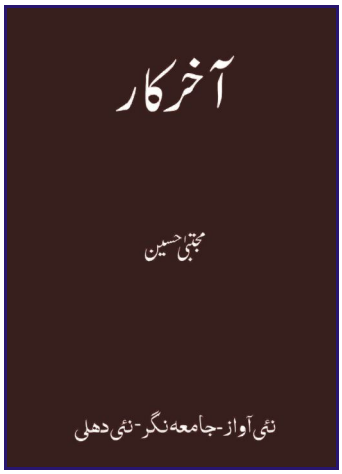

ایک زمانہ تھا جب میرا زیادہ تر وقت لائبریریوں میں گذرتا تھا۔لیکن جب میں نے دیکھا کہ سماج میں جہلا ترقی کرتے چلے جارہے ہیں اور اونچی اونچی کرسیوں پر قبضہ جما چکے ہیں تو میں نے سوچا کہ لعنت ہے ایسے علم پر جس سے علم کی پیاس تو بھلے ہی بجھ جائے لیکن پیٹ کی آگ نہ بجھنے پائے۔ملک کی یونیورسٹی پر غصہ بھی آیا کہ اگر وہ علم کو پھیلانے کے بجائے جہالت کو ہی عام کرنے کا بیڑہ اٹھالیتیں تو آج ملک نہ جانے کتنی ترقی کر لیتا۔اس خیال کے آتے ہی میں نے لائبریریوں کو خیر باد کہا اور پھر کبھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ میں نے باہر آکر جہالت کے گُر سیکھنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ سیاستدانوں کی صحبتوں سے فیضیاب ہوا کہ یہ ہستیاں جہالت کا سرچشمہ ہوتی ہیں۔لیکن یہ گُر نہ آیا۔کسی نے سچ کہا ہے کہ علم کی دولت آدمی کے پاس ایک بار آجاتی ہے تو پھر کبھی نہیں جاتی۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ اپنے اندر یہ جو علم کا افلاس ہے اسے کسی طرح باہر نکالوں اور اس کی جگہ جہالت کی دولت سے اپنے سارے وجود کو مالا مال کردوں مگر یہ کام نہ ہوسکا۔ یہ اور بات ہے کہ ایک عرصہ تک علم سے لگاتار اور مسلسل دور رہنے کی وجہ سے میں نے تھوڑی بہت ترقی کر لی ہے۔

مگر پچھلے دنوں بات کچھ یوں ہوئی کہ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ کہیں جارہا تھا۔راستہ میں اسے اچانک ایک ضروری کام یاد آگیا۔اس نے کہا کہ وہ دو گھنٹوں میں واپس آجائے گا۔تب تک میں یہیں اس کا انتظار کروں۔ سامنے ایک پارک تھا۔ سوچا کہ یہاں وقت گذار لوں لیکن اس عمر میں نوجوانوں کی خوشگوار مصروفیتوں اور ناخوشگوار حرکتوں میں مخل ہونا پسند نہ آیا۔سامنے ایک ہوٹل تھا جہاں نہایت اونچی آواز میں موسیقی کو بجا کر گاہکوں کو ہوٹل کے اندر آنے سے روکا جارہا تھا۔اب وہ پرانی لائبریری ہی برابر میں رہ گئی تھی جس میں میں اپنے زمانۂ جاہلیت میں نہایت پابندی سے جایا کرتا تھا۔خیال آیا کہ چلو آج لائبریری میں چل کر دیکھتے ہیں کہ کس حال میں ہیں یارانِ وطن۔

افسوس ہوا کہ اب بھی وہاں کچھ لوگ علم کی دولت کو سمیٹنے میں مصروف تھے۔ چونکہ علم کی دولت چرائی نہیں جاسکتی۔اسی لئے ایک صاحب ضروری علم کو حاصل کرنے کے بعد اپنے سارے گھوڑے بیچ کر کتاب پر سر رکھ کر سو رہے تھے۔ چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ بہت دنوں بعد لسان العصر حضرت شیکسپیئر،

مصور فطرت علامہ ورڈ سورتھ، شمس العلماء تھامس ہارڈی، مصورِ غم جان کیٹس وغیرہ کی کتابوں کا دیدار کرنے کا موقع ملا۔ میں نے سوچا کہ ان کتابوں میں اب میرے لئے کیا رکھا ہے۔ کیوں نہ اردو کتابوں کی ورق گردانی کی جائے۔ چنانچہ جب میں لائبریری کے اردو سکشن میں داخل ہوا تو یوں لگا جیسے میں کسی بھوت بنگلہ میں داخل ہوگیا ہوں۔ میں خوفزدہ سا ہوگیا۔ لیکن ڈرتے ڈرتے میں نے گرد میں اٹی ہوئی 'کلیات میر' کھولی تو دیکھا کہ اس میں سے ایک موٹی تازی دیمک بھاگنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں اسے مارنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک دیمک نے کہا ''خبردار! جو مجھے ہاتھ لگایا تو۔ میں دیمکوں کی ملکہ ہوں۔ باادب باملاحظہ ہوشیار۔ ابھی ابھی محمد حسین آزاد کی 'آب حیات' کا خاتمہ کرکے یہاں پہنچی ہوں۔ جس نے 'آب حیات' پی رکھا ہو اسے تم کیا مارو گے۔ 'قاتل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم'

دیمک کے منہ سے اردو کے مصرعہ کو سن کر میں بھونچکا سا رہ گیا۔ میں نے حیرت سے کہا ''تم تو بہت اچھی اردو بول لیتی ہو بلکہ اردو شعروں پر بھی ہاتھ صاف کرلیتی ہو۔'

بولی 'اب تو اردو ادب ہی میرا اوڑھنا بچھونا اور کھانا پینا بن گیا ہے۔'

پوچھا 'کیا اردو زبان تمہیں بہت پسند ہے؟'

بولی 'پسند ناپسند کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ زندگی میں سب سے بڑی اہمیت آرام اور سکون کی ہوتی ہے جو یہاں مجھے مل جاتا ہے۔ تم جس سماج میں رہتے ہو وہاں آرام، سکون اور شانتی کا دور دور تک کہیں کوئی پتہ نہیں ہے۔ امن و امان کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہو۔ اب اگر میں یہاں آرام سے رہنے لگی ہوں تو تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے۔'

میں نے پوچھا 'لیکن تمہیں یہاں سکون کس طرح مل جاتا ہے؟'

بولی 'ان کتابوں کو پڑھنے کے لئے اب یہاں کوئی آتا ہی نہیں ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ ساری کتابیں میرے لئے فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کا درجہ رکھتی ہیں۔ مجھے تو یقین ہے کہ ہو نہ ہو کہیں تم خود مصنف تو نہیں ہو؟'

میں نے حیرت سے پوچھا: 'تم نے کیسے پہچانا کہ میں مصنف ہوں۔'

بولی 'میں تمہیں جانتی ہوں۔ ایک رسالہ کی ورق نوشی کرتے ہوئے میں نے تمہاری تصویر دیکھی تھی

> مجتبیٰ حسین میں حیدرآبادی تہذیب، شائستگی اور علم مجلس کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ان کی گفتگو کی شگفتگی اور دلآویزی ان کی تحریر سے کسی صورت کم نہیں۔ مجتبیٰ حسین کے خطوط بھی بڑے پرخلوص اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ جہاں تک مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ خاکوں اور انشائیوں کا تعلق ہے وہ اسی وقت قلم اٹھاتے ہیں جب انہیں واقعی کچھ کہنا ہوتا ہے۔ ان کی تحریر سے اکتاہٹ نہیں ہوتی۔ ابتدائی شگفتگی اور خوش دلی آخر تک قائم رہتی ہے۔ مجتبیٰ حسین کے بعض مزاحیہ خاکوں میں درد کی ایک ہلکی سی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔
> **(وجاہت علی سندیلوی)**

بلکہ تھوڑی سی تصویر کھائی بھی تھی۔ ایک دم بدذائقہ اور کڑوی کسیلی نکلی۔ حالانکہ وہ تمہاری جوانی کی تصویر تھی۔ پھر بھی اتنی کڑوی کہ کئی دنوں تک منھ کا مزہ خراب رہا۔ میں تو بڑی مشکل سے صرف تمہاری آنکھیں ہی کھا سکی تھی کیونکہ تمہارے چہرے میں کھانے کے لیے ہے ہی کیا۔ تم اردو کے مصنفوں میں یہی تو خرابی ہے کہ تصویریں ہمیشہ اپنی نوجوانی کی چھپواتے ہو اور تحریریں بچوں کی سی لکھتے ہو۔ اور ہاں خوب یاد آیا تم نے کبھی سرسید احمد خان کو بغیر داڑھی کے دیکھا ہے؟ نہیں دیکھا تو 'آثارالصنادید' کی وہ جلد دیکھ لو جو سامنے پڑی ہے۔ ایک دن خیال آیا کہ سرسید داڑھی اور اپنی مخصوص ٹوپی کے بغیر کیسے لگتے ہوں گے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے بڑے جتن کے ساتھ سرسید احمد خان کی ساری داڑھی نہایت احتیاط سے کھالی۔ پھر ٹوپی کا صفایا کیا۔ اب جو سرسید احمد خان کی تصویر دیکھی تو معاملہ وہی تھا۔ 'قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا'۔ اب یہ تصویر میرے آرٹ کا ایک نادر نمونہ ہے۔ مجھے تصویروں میں مسکراہٹیں بہت پسند آتی ہیں۔ مونالیزا کی مسکراہٹ تو اتنی کھائی کہ کئی بار بدہضمی ہوگئی۔ زمانے کو اس کی مسکراہٹ آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔ مجھے اس کا ذائقہ سمجھ میں نہیں آیا۔ عجیب کھٹ میٹھا سا ذائقہ ہے۔ کھاتے جاؤ تو بس کھاتے ہی چلے جاؤ۔ پیٹ بھلے ہی بھر جائے لیکن نیت نہیں بھرتی۔'

میں نے کہا 'تم تو آرٹ کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتی ہو۔'

بولی 'جب آدمی کا پیٹ بھرا ہو تو وہ آرٹ اور کلچر کی طرف راغب ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ کیڑوں مکوڑوں کا پیٹ بھر جائے تو وہ بھی یہی کرتے ہیں۔ تب احساس ہوا کہ انسانوں اور کیڑوں مکوڑوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ خیر اب تو تم لوگ بھی اپنی زندگی حشرات الارض کی طرح ہی گزار رہے ہو۔'

میں نے کہا 'اب جب کہ تم نے خاصے اردو ادب کو چاٹ لیا ہے تو یہ بتاؤ یہ تمہیں کیسے لگتا ہے؟'

بولی 'شروع شروع میں یہ میرے پلے نہیں پڑا تھا۔ بڑا ریاض کیا۔ متقدمین کے دیوان چاٹے۔ مشکل یہ ہوئی کہ میں نے سب سے پہلے 'دیوانِ غالب' پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی۔ خاک سمجھ میں نہ آیا۔ لہٰذا مولوی اسماعیل میرٹھی کی آسان اور زود ہضم نظمیں پہلے نوش جان لیں۔ پھر وہ کیا کہتے ہیں آپ کے مفلروالے شاعر، وہی جو پانی پت میں رہتے تھے مگر وہاں کی جنگوں میں شریک نہیں تھے۔ ارے اپنے وہی مولانا حالی۔ ان کی نصیحت آمیز شاعری پڑھی۔ شاعری کم

کرتے تھے نصیحت زیادہ کرتے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ تم لوگوں نے ان کی نصیحتوں پر عمل نہیں کیا۔ اگر کیا ہوتا تو آج تمہارے گلے میں بھی روایات کا ایک بوسیدہ سا مفلر ہوتا۔ اب تو خیر سے سارا ہی اردو ادب میری مٹھی میں ہے۔ سب کو چاٹ چکی ہوں۔ ایک بار غلطی سے جوش ملیح آبادی کی ایک رباعی چاٹ لی طبیعت میں ایسا بھونچال آیا کہ سارا وجود آپے سے باہر ہونے لگا۔ اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے چارو ناچار، جاں نثار اختر کی گھر آنگن والی شاعری چاٹنی پڑی۔ ویسے تو میں نے دنیا کی کم وبیش ساری زبانوں کی کتابیں چاٹ لی ہیں لیکن اردو شاعروں میں ہی یہ وصف دیکھا ہے کہ اپنے معشوق کو کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ کوئی معشوق کے گیسو سنوارنا چاہتا ہے تو کوئی انہیں بکھیر دینا چاہتا ہے۔ کوئی وصل کا طالب ہے تو کوئی ہجر کی لذتوں میں سرشار رہنا چاہتا ہے۔ کوئی معشوق کو کوٹھے پر بلانے کا قائل ہے تو کوئی اس کا دیدار بھی یوں کرنا چاہتا ہے جیسے چوری کر رہا ہو۔ تم لوگ آخر معشوق سے چاہتے کیا ہو۔ اسے ہزار طرح پریشان کیوں کرتے ہو۔ اردو شاعری میں معشوق خود شاعر سے کہیں زیادہ مصروف نظر آتا ہے۔ یہ بات کسی اور زبان کے معشوق میں نظر نہیں آئی۔ اردو شاعروں کا عشق بھی عجیب وغریب ہے۔ عشق کرنا ہو تو سیدھے سیدھے عشق کرو بھائی۔ کس نے کہا ہے تم سے کہ معشوق کی یاد آئے تو آسمان کی طرف دیکھ کر تارے گنتے رہو۔ اس کی یاد نے زور مارا تو اپنا گریبان پھاڑنے کے لئے بیٹھ جاؤ۔ معلوم ہے کپڑا کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔ سیدھے سیدھے معشوق کے پاس جاتے کیوں نہیں۔ اپنے دل کا مدعا بیان کیوں نہیں کرتے۔ عاشق، بزدل اور ڈرپوک ہو تو ایسے ہی چونچلے کر کے اپنے دل کو بہلاتا رہتا ہے۔'

میں نے کہا 'اردو ادب پر تو تمہاری گہری نظر ہے۔'

بولی 'اب جو کوئی اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہی نہیں تو سوچا کہ کیوں نہ میں ہی نظر رکھ لوں۔'

پوچھا 'داغ دہلوی کے کلام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'

بولی 'ان کا کلام گانے کے چکر میں اچھی خاصی بیبیاں طوائفیں بن گئیں۔ مجھے تو طبلہ اور سارنگی کے بغیر ان کا کلام سمجھ میں ہی نہیں آتا۔'

پوچھا 'اور ہمارے فانی بدایونی؟'

بولی 'ان کے غم پر بے پناہ ہنسی آتی ہے۔ عجیب مضحکہ خیز غم ہے۔'

'اور مولانا آزاد؟'

بولی 'زندگی بھر ٹھاٹ سے عربی لکھتے رہے اور لوگ اسے اردو سمجھ کر پڑھتے رہے۔ عربی کے کسی ادیب کو اردو میں شاید ہی اتنی شہرت ملی ہو۔'

میں نے کہا 'یہ بتاؤ تمہیں اردو کی کتابیں کیسی لگتی ہیں؟'

بولی 'تمہارا جو ادب لیتھوگرافی کے ذریعہ چھپا ہے اسے کھاؤ تو یوں لگتا ہے جیسے باسی روٹی کے ٹکڑے چبا رہی ہوں۔ پھر جگہ جگہ کتابت کی غلطیاں کباب میں ہڈی کی طرح چلی آتی ہیں۔ لیکن جو کتابیں اردو اکیڈمیوں کے جزوی مالی تعاون کے ذریعے چھپنے لگی ہیں وہ بہت لذیذ ہوتی ہیں۔ میں تو جزوی امداد کی چاٹ میں کل کتاب ہی کو کھا جاتی ہوں۔ ان میں ادب ہو یا نہ ہو کھانے میں لذیذ ہوتی ہیں کیونکہ مفت خوری میں جو مزہ ہے وہ محنت کی کمائی میں کہاں۔ اعزازی زندگی گذارنے کی شان ہی جداگانہ ہوتی ہے۔ ہاں ایک بات اور، اردو کا مصنف اور شاعر اپنی کتابوں کے دیباچوں میں بات بات پر اس قدر شکریے کیوں ادا کرتا ہے۔ پبلشر اور سرپرستوں وغیرہ کا شکریہ تو خیر پھر بھی برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن اردو کا مصنف اس سائیکل رکشہ والے کا بھی شکریہ ادا کرنے پر مجبور نظر آتا ہے جس میں بیٹھ کر وہ کتاب کی پروف ریڈنگ کرنے جایا کرتا تھا۔ اس کا شکریہ ادا کرنے سے تو یہی گمان ہوتا ہے کہ اردو کا مصنف سائیکل رکشہ والے کو کرایہ ادا نہیں کرتا۔ تبھی تو اتنا گڑگڑا کر اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر ممنون ہوتا رہتا ہے۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا کہ ایک شاعر نے اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت کے لئے چمڑے کے ایک بیوپاری کا یوں شکریہ ادا کیا تھا جیسے چمڑے کا یہ بیوپاری نہ ہوتا تو اردو ادب دربدر ٹھوکریں کھاتا پھرتا اور وہ بھی ننگے پاؤں۔ بھیا چمڑے کا کاروبار اور چمڑی کا کاروبار دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ تم اپنی شاعری میں چمڑی کا کاروبار کرتے ہو۔ پھر چمڑے کے بیوپاری کو اس کی ساری خباثتوں کے ساتھ ادب میں کیوں لے آتے ہو؟'

میں نے کہا 'کیا تم یہ چاہتی ہو کہ اردو کے ادیب اور شاعر کسی کا شکریہ نہ ادا کریں؟'

بولی 'شکریہ ادا کرنا اچھی بات ہے لیکن اصل میں جس کا شکریہ ادا ہونا چاہئے اس کا تو ادا کرو۔'

میں نے پوچھا 'مثلاً کس کا؟'

شرما کر بولی 'مجھے کہتے ہوئے لاج سی آتی ہے۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو تو اب میرے سوا کسی اور کا شکریہ ادا نہیں کرنا چاہئے کیونکہ بالآخر اب میں ہی ان کی کتابوں میں پائی جاتی ہوں، ورنہ انہیں پوچھتا کون ہے؟'

دیمکوں کی ملکہ کی بات بالکل سچی تھی۔ میں نے گھبرا کر کہا: 'تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ اگلی بار اگر میری کوئی کتاب چھپی تو اس میں تمہارا شکریہ ضرور ادا کروں گا۔'

ہنس کر بولی 'اتنی ساری بات چیت کے بعد بھی تم اپنی کتاب چھپواؤ گے۔ بڑے بے شرم اور ڈھیٹ ہو۔ مرضی تمہاری۔ ویسے میرا شکریہ ادا کرنے کے بجائے کتاب ہی میرے نام معنون کر دو تو کیسا رہے گا۔'

یہ کہہ کر دیمکوں کی ملکہ 'کلیات میر' کی گہرائیوں میں کہیں گم ہو گئی اور میں لائبریری سے بالکل نکل آیا۔

❑❑❑

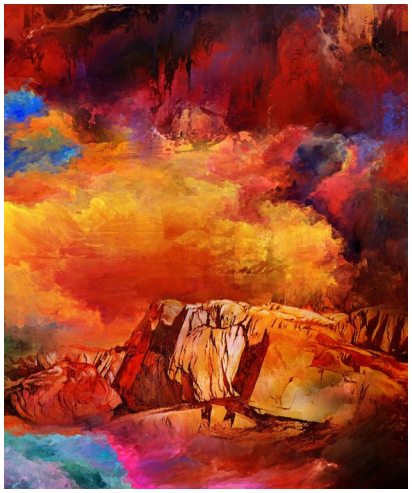

خوشونت سنگھ کی یاد میں

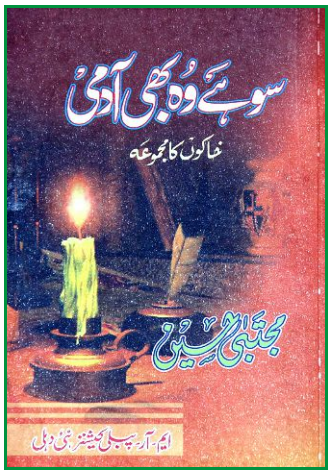

مارچ کے مہینے کی بیسویں تاریخ اور دوپہر کا وقت ہے۔ ابھی ابھی دہلی سے اطلاع آئی ہے کہ انگریزی کے مایۂ ناز صحافی اور ہندوستانی ادب کی سب سے برگزیدہ اور معتبر ہستی خوشونت سنگھ کا چند منٹ پہلے نہایت پُرسکون حالت میں انتقال ہوگیا۔ دل پر جو صدمہ گزر رہا ہے، اس کا حال بیان کرنے کے لئے لفظ بھی آب دیدہ اور گلوگیر دکھائی دینے لگے ہیں۔ سکتہ طاری ہوگیا ہے۔ خوشونت سنگھ جیسے سرپرست، بزرگ دوست، بہی خواہ اور محسن کا گزر جانا میرے لئے ایک عظیم شخصی سانحہ ہے۔ پچھلے مہینے ہی وہ دو فروری کو ۹۹ برس کے ہوگئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ پچھلے دو تین برسوں سے وہ رفتہ رفتہ کمزور اور نحیف ہوتے چلے جارہے تھے اور ان کے بارے میں کسی بھی وقت بری خبر سننے کا دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے جالندھر سے چھپنے والے اردو اخبار 'ہند سماچار' کے ۱۲ ستمبر ۲۰۱۲ء کے شمارے میں ان کا ایک کالم چھپا تھا جس کا عنوان تھا 'بہت جی لیا میں نے اب مرنا چاہتا ہوں'۔ خوشونت سنگھ سے گہرے تعلق خاطر اور عقیدت کے باعث میں نے اس کا تراشا اپنے پاس محفوظ کرلیا تھا۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

'میں ۹۸ برس کا ہوگیا ہوں۔ اپنی موجودہ صحت کے مدنظر ہر ہفتہ دو کالم لکھنا میرے لئے مشکل ہوتا جارہا ہے۔ بغیر کسی رکاوٹ کے پچھلے ستر سال سے زائد برسوں سے میں یہ کالم لکھ رہا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اب مرنا چاہتا ہوں۔ بہت جی لیا اور اب زندگی سے تنگ آچکا ہوں۔ کچھ اور کرنے کی تمنا نہیں ہے کیونکہ زندگی میں جو کچھ کرنا چاہتا تھا وہ کرچکا ہوں تو پھر زندگی کو لٹکائے رکھنے کا کیا مطلب ہے؟ جب کرنے کو کچھ بچا ہی نہیں ہے۔ واحد تسلی پچھلی یادوں کو تازہ کرنا ہی ہے۔ جسم جب لاش بن جائے تو پریتم کی یاد ہی کافی ہے۔'

خوشونت سنگھ نے بڑی بھرپور تخلیقی زندگی جی اور اپنی بے مثال تحریروں کے ذریعہ ہندوستانی ادب اور صحافت دونوں کے سرمائے کو مالا مال کیا۔ ایسے ادیب اور دانشور صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے فرزند راہل سنگھ نے بتایا کہ آخر وقت تک ان کے ہوش وحواس بالکل قائم اور برقرار رہے۔ صبح اٹھ کر انہوں نے ناشتہ کیا، اخبارات کا مطالعہ کیا، کچھ بات چیت بھی کی پھر حسب معمول آرام کرنے کے لئے بستر پر جو دراز ہوئے تو نہایت پرسکون انداز میں چپ چاپ اس جہان فانی سے کوچ کرگئے۔ نہ تیمارداروں کو زحمت

دی اور نہ رشتے داروں کو خدا حافظ کہنے کا موقع دیا۔ غرض خوشونت سنگھ کے حصے میں ویسی ہی موت آئی جس کی آرزو انہوں نے اپنے ایک سال پرانے کالم میں کی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی چار پانچ برس پہلے تک خوشونت سنگھ ٹینس بھی کھیلا کرتے تھے، تیراکی بھی کیا کرتے تھے اور چہل قدمی تو نہایت پابندی سے کرتے تھے۔ بھلے ہی اپنے کالموں میں وہ اپنی میخواری کا ذکر مزے لے لے کر کیا کرتے تھے تاہم وہ نہایت منظم اور سلیقہ مند زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ میں نے کبھی خوشونت سنگھ کو شراب پی کر بہکتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ ہی شراب کے تین پیگوں والی مقررہ اعظم ترین حد سے انہیں آگے جاتے دیکھا۔ ہمیشہ خوشگوار اور دلچسپ گفتگو کرتے تھے۔ وہ ڈسپلن کے سخت پابند تھے۔ رات میں جلدی سوجاتے تھے اور علی الصباح ۴ بجے بیدار ہوجایا کرتے تھے۔ پانچ چھ برس پہلے میں زیادہ تر دہلی میں رہا کرتا تھا اور اکثر و بیشتر خوشونت سنگھ کی صحبتوں سے مجھے فیضیاب ہونے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ خوشونت سنگھ سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۹ء میں ممبئی میں ہوئی تھی۔ جب وہ ٹائمس آف انڈیا کے ہفتہ وار رسالہ 'السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا' کے ایڈیٹر تھے تاہم ان سے باضابطہ ملاقاتوں کا سلسلہ ۱۹۷۶ء میں اس وقت شروع ہوا جب وہ میری اور خلیق انجم کی مرتبہ کتاب 'ضبط شدہ نظمیں' کے ہندی ایڈیشن کی رسم اجراء انجام دینے کی غرض سے دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب میں آئے تھے۔ تقریب کے اختتام پر چائے نوشی کے دوران تھوڑی سی رسمی باتوں کے بعد انہوں نے شکوہ کیا کہ دہلی میں رہتے ہو مگر ملتے نہیں۔ میں نے جواب شکوہ کے طور پر عرض کیا کہ آپ کی مصروفیات کے پیش نظر ملنے سے کتراتا ہوں۔ ورنہ آپ سے کون ملنا نہیں چاہتا۔

بولے، جب بھی آؤ گے، مصروفیات کو تہہ کرکے رکھ دوں گا۔ پہلے آؤ تو سہی۔ ان دنوں اقبال کی نظم شکوہ و جواب شکوہ کا انگریزی ترجمہ کررہا ہوں۔ اردو داں یوں سے مل کر یوں بھی خوشی ہوتی ہے۔ کسی وقت چلے آؤ۔

ان دنوں وہ انگریزی رسالہ 'نئی دہلی' کے ایڈیٹر ہوگئے تھے۔ دوسرے دن میں نے ان کے دفتر فون کرکے کہا۔ آداب عرض ہے۔ جواباً بولے، وعلیکم السلام! کیسے ہو؟ (زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب میرے آداب کا جواب کسی نے 'وعلیکم السلام' سے دیا تھا۔) مجھے اس غیر متوقع وعلیکم السلام سے سنبھلنے میں ذرا سی دیر ہوئی تو خود ہی بولے، بہت اچھے وقت فون کیا۔ میں اس وقت جواب شکوہ کے ایک بند کا ترجمہ کررہا ہوں۔ تم 'قدسی الاصل' کا انگریزی میں ترجمہ کس طرح کروگے؟ میں ابھی وعلیکم السلام ہی میں اٹکا ہوا تھا کہ انہوں نے مجھے 'قدسی الاصل' میں پھنسا دیا۔ میں سٹپٹا سا گیا۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ میں انگریزی بھی اتنی ہی جانتا ہوں جتنی کہ اردو۔ اب اپنی کم مائیگی کو چھپانے کا واحد طریقہ یہ رہ گیا تھا کہ میں مذاق کا سہارا لوں۔ لہٰذا میں نے کہا: ہمارا ٹیلی فونی نظام کچھ ایسا ہے کہ اس پر اردو الفاظ کا انگریزی ترجمہ عموماً غلط ہوجاتا ہے۔ آپ سے ملاقات ہوگی تو 'قدسی الاصل' سے نپٹ لیں گے۔ بولے، اچھا یہ بتاؤ 'پیر گردوں' اور 'فتنہ' کا تم انگریزی ترجمہ کس طرح کروگے؟

وعلیکم السلام، قدسی الاصل، پیر گردوں، فتنہ...

اب پانی سر سے اونچا ہوچکا تھا۔ میری حالت غیر ہونے لگی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔ میں نے چیخ کر کہا، ہیلو، ہیلو۔ آپ کی آواز صاف نہیں سنائی دے رہی ہے۔ وہ باآواز بلند بولے، پیر گردوں، پیر گردوں۔ جی میں آیا کہہ دوں: معاف کیجئے یہاں کوئی 'پیر گردوں' نہیں رہتا۔ رانگ نمبر۔

غرض فون کی خرابی کا حوالہ دے کر میں نے فتنے کو دوسرے دن پر ٹالا۔ بولے۔ کل گیارہ بجے دفتر میں آجاؤ۔ فون کا ریسیور رکھ کر میں نے فوراً ایک دوست کے یہاں سے کلیات اقبال کا ایک نسخہ منگوایا، ڈکشنری سنبھالی اور زندگی میں پہلی مرتبہ شکوہ و جواب شکوہ کا نئے ڈھنگ سے مطالعہ کرنے میں مصروف ہوگیا۔

دوسرے دن ان کے دفتر گیا تو میرے آداب عرض کے جواب میں حسب معمول وعلیکم السلام کہہ کر زوردار مصافحہ کیا۔ ابھی میں کرسی پر اچھی طرح بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ میری نظر دیوار پر پڑ گئی۔ جس پر ایک طغرے میں 'اللہ' لکھا تھا اور دوسرے طغرے میں 'سورۂ یٰسین' میں سوچنے لگا: خوشونت سنگھ بھی عجیب آدمی ہیں۔ کل وعلیکم السلام کے بعد قدسی الاصل اور پیر گردوں میں پھنسا دیا اور آج وعلیکم السلام کے بعد ان طغروں کا نظارہ کرادیا۔ تھوڑی دیر کے لئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی اردو رسالے کے دفتر میں آگیا ہوں۔ میں ان کے طغروں کو غور سے دیکھنے لگا تو بولے: جی ہاں، یہ طغرے ہمیشہ میرے دفتر میں ہوتے ہیں۔ 'السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا' کا جب ایڈیٹر تھا تب بھی یہ طغرے میرے کمرے میں تھے۔ اب یہاں سے کہیں اور جاؤں گا تو انہیں بھی ساتھ لیتا جاؤں گا۔ یہی نہیں، میری موٹر کی چابی پر پوری آیت الکرسی لکھی ہوئی ہے۔ اس کے بعد مجھے اچانک محسوس ہوا کہ اقبال کے شکوہ و جواب شکوہ کا انگریزی ترجمہ کرنے کا حق خوشونت سنگھ کے علاوہ کسی اور کو نہیں پہنچتا۔ پھر میں نے ان کی میز پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ جابجا اقبال کے کلام کے نسخے بکھرے پڑے ہیں۔ پیچھے ایک شیلف میں انگریزی کتابوں کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی نظر آئیں سوچا تھا کہ وہ ملتے ہی قدسی الاصل اور پیر گردوں کا ذکر ضرور چھیڑیں گے مگر اس وقت وہ قدسی الاصل کو بالکل بھول چکے تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

میں نے ہی چھیڑنے کے انداز میں کہا: اقبال کی نظم شکوہ و جواب شکوہ کو لکھے ہوئے ستر برس کا عرصہ

بیت گیا۔ کیا آپ نہیں سمجھتے کہ آج کے دور سے اس نظم کا رشتہ کچھ کمزور سا ہو گیا ہے۔ پھر بیسویں صدی کے پہلے دہے میں اسلامی ممالک کی جو حالت تھی، وہ آج نہیں ہے۔ ستر برس پہلے تک کئی اسلامی ممالک کو تیل کی دولت کا اندازہ نہیں تھا۔ اقبال اگر آج کے دور میں یہ نظم کہتے تو ان کا شکوہ اور جواب شکوہ دونوں مختلف ہوتے۔ اس کے جواب میں خوشونت سنگھ نے شکوے کے دو بند اپنی پاٹ دار آواز میں نہایت اثر انگیزی کے ساتھ سنائے۔ پھر پوچھا: کیا ان بندوں کو سن کر تمہارے رونگٹے نہیں کھڑے ہو گئے۔ یہ دیکھئے میرے رونگٹے! آپ تو مسلمان ہیں۔ اس نظم کو پڑھ کر ایک سکھ تک کے رونگٹے کھڑے ہو سکتے ہیں تو مسلمانوں کے رونگٹوں کو کیا ہوا ہے؟ انسان کا خدا سے شکوہ ایک ابدی حقیقت ہے جو ستر برس بعد بھی رہے گی۔ رہی بات اسلامی ممالک کے حالات کی تبدیلی کی تو میرے خیال میں موجودہ حالات سے یہ نظم زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ دیکھئے افغانستان میں کیا ہو رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کے دور میں اس نظم کو صحیح ڈھنگ سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اصلی اور اچھی شاعری پر ماہ و سال کی گرد نہیں جمنے پاتی۔ اسی لئے تو میں نے اس نظم کا ترجمہ کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔

ترجمہ، وہ بھی شاعری کا اور وہ بھی اقبال کی شاعری کا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ خوشونت سنگھ نے اقبال کی اردو شاعری کے مزاج، اس کے لہجے اور اس کے اچھوتے احساس کو جس خوبصورتی کے ساتھ انگریزی میں منتقل کیا ہے، اس کا اندازہ اس ترجمے کو پڑھنے کے بعد ہی لگایا جا سکتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ شکوہ و جواب شکوہ کے انگریزی ترجمے کی تقریب رونمائی جب منعقد ہوئی تھی تو پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایک اردو لفظ کے انگریزی ترجمے پر اعتراض کیا تھا۔ بعد میں خوشونت سنگھ نے جو حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، اپنی جوابی تقریر میں پروفیسر نارنگ سے کہا تھا کہ ترجمے کی دشواریوں کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو راست طور پر اس عمل سے گزرے۔ میں برے لفظوں کی بات نہیں کرتا۔ اردو اور ہندی شاعری میں دو بہت سیدھے سادے اور معمولی لفظ اکثر استعمال ہوتے ہیں 'انگڑائی' اور 'جوبن' آپ ذرا ان کا انگریزی ترجمہ کر کے دکھا دیں۔ ہماری انگڑائی میں اور انگریزی کی انگڑائی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ خوشونت سنگھ کے اس جواب پر محفل زعفران زار بن گئی تھی۔

غرض اقبال کے شکوہ اور جواب شکوہ کے حوالے سے جو ملاقاتیں شروع ہوئی تھیں وہ بالآخر ایک گہرے اور بے تکلف اٹوٹ رشتے میں تبدیل ہو گئیں۔ خوشونت سنگھ مجھے اس قدر عزیز رکھنے لگے کہ اگر میں کسی ہفتے ان کے یہاں نہ جاتا تو ان کا فون آ جاتا۔ میاں! کہاں غائب ہو گئے۔ کیا کسی معشوق کی زلف کے اسیر ہو گئے ہو، فٹافٹ آ جاؤ۔ خوشونت سنگھ کا اصول یہ تھا کہ وہ کسی سے ملاقات کا وقت طے کئے بغیر اپنے گھر پر نہیں ملتے تھے چاہے وہ صدر جمہوریہ ہند ہی کیوں نہ ہوں تاہم انہوں نے مجھ ناچیز کو از راہ عنایت ان دو چار افراد کی فہرست میں شامل کر رکھا تھا جو ان کے گھر پر کسی بھی وقت بغیر اجازت کے مل سکتے تھے۔ انہوں نے اس فہرست کو اپنے ایک کالم میں شائع بھی کیا تھا۔ انہوں نے میرے بارے میں نہ صرف یہ کہ کئی کالم لکھے بلکہ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے جہاں آل احمد سرور اور علی سردار جعفری جیسے باکمال اردو والوں کا ذکر کیا ہے، وہاں مجھ ناچیز کا بھی بطور خاص ذکر کیا۔ میرے لئے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی کہ خوشونت سنگھ اپنے کئی کالموں میں میرا ذکر نہایت محبت کے ساتھ بے تکلف انداز میں کر دیتے تھے۔ لیجئے ان کے ایک کالم کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

Mujtaba is rare among Indian writers of humour. While he is unable to say anything unkind about others, he is equally unable to say anything in his own praise. he is also well-read, widely travelled and has a keen eye for detail. He hardly ever talks about himself. it was only after i read his travelogues. I realised that he could laugh at himself. He had reason to rest on his laurels: Whenever the subject humour in Urdu writing comes up, the first name that is mentioned is of Mujataba Husain of Hyderabad.

وہ ایک بیباک صحافی، سچے سیکولر، دانشور اور راست گو انسان تھے۔ وہ اردو کے سچے پرستار اور اقلیتوں کے بے لوث ہمدرد بھی تھے۔ بابری مسجد کے انہدام پر انہوں نے جو بے مثال کالم لکھا تھا، اسے لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ وہ کسی مصلحت پسندی کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتے تھے اور سچائی کا پوری بیباکی کے ساتھ اظہار کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔

پاکستان سے انہیں محبت تھی کیونکہ ان کے بچپن اور جوانی کے دن پاکستان کے پنجاب میں گزرے تھے۔ پاکستان سے جب بھی کوئی اردو کا اہم ادیب یا شاعر دہلی آتا تو مجھ سے خواہش کرتے تھے کہ میں انہیں ان کے گھر ضرور لے آؤں۔ صادقین، قتیل شفائی، منیر نیازی، حمید اختر، عطاالحق قاسمی، اظہر جاوید، ضمیر جعفری، شاہدہ حسن، لالی چودھری، کن کن کا ذکر کروں۔ جب سے خوشونت سنگھ کے انتقال کی خبر سنی ہے، ذہن ماؤف سا ہو گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ سیکڑوں ملاقاتوں کا ذکر کس طرح کروں۔ یہ زخم تو بہت لمبے عرصے میں مندمل ہوگا۔ یادوں کا ایک سیلاب ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ وہ نہایت بذلہ سنج اور ظریف

الطبع انسان تھے۔انہیں لطیفے سننے اور سنانے کا نہ صرف شوق تھا بلکہ ہَوکا سا تھا لہٰذا ان کی محفل ہمیشہ زعفران زار بنی رہتی تھی۔ میرے کرم فرما ہاشم علی اختر جب علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو انہوں نے مجھے وائس چانسلروں کے بارے میں ایک دلچسپ لطیفہ سنایا تھا۔لطیفہ کچھ اس طرح تھا کہ عالم بالا میں جنت کے باب الداخلہ کے آگے جنت میں جانے کے خواہش مند حضرات کی قطار لگی ہوئی تھی اور داروغۂ جنت بار باری سے ہر فرد کو اس کے اعمال نامے کے حساب سے اندر جانے کی اجازت دے رہا تھا۔جنت میں داخلہ کے ایک خواہش مند سے داروغۂ جنت نے پوچھا کہ آپ نیچے کی دنیا میں کیا کام کرتے تھے؟ خواہش مند نے دست بستہ عرض کیا: حضور میں ایک یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوا کرتا تھا۔اتنا سنتے ہی داروغۂ جنت نے حکم دیا: اسے جنت میں جانے دو کیونکہ دوزخ میں رہنے کی سزا یہ پہلے ہی ایک یونیورسٹی میں بھگت چکا ہے۔ چنانچہ داروغۂ جنت کی خدمت میں سلام عرض کرنے کے بعد جب وائس چانسلر مذکور جنت میں جانے لگا تو اس کے پیچھے پیچھے ایک اور خواہش مند بھی جنت میں گھسنے لگا۔ داروغۂ جنت نے اسے فوراً پکڑ لیا اور پوچھا: تم کہاں جنت میں گھسے چلے جا رہے ہو۔ جواب ملا: حضور! میں بھی نیچے کی دنیا میں ایک یونیورسٹی کا وائس چانسلر رہ چکا ہوں۔ داروغۂ جنت نے پوچھا: یہ تو بتاؤ تم کتنی میعادوں کے لئے وائس چانسلر تھے؟ دوسرے وائس چانسلر مذکور نے نہایت فخریہ انداز میں کہا: حضور! میں دو میعادوں کے لئے وائس چانسلر رہ چکا ہوں۔اس پر داروغۂ جنت نے نہایت تحکمانہ لہجے میں کہا: ایسی بات ہے تو اسے فوراً دوزخ میں ڈال دیا جائے کیونکہ اسے تو دوزخ میں رہنے کی عادت اور لت پڑ چکی ہے۔ میں نے خوشونت سنگھ کو یہ لطیفہ سنایا تو بڑی دیر تک بے ساختہ ہنستے رہے۔ کہتے ہیں کہ ایک اچھا لطیفہ ساری قوم کی ملکیت ہوتا ہے لیکن خوشونت سنگھ لطیفوں کے مالکانہ حقوق کے قائل تھے۔ چنانچہ ان کی روایت تھی کہ جب بھی وہ کوئی اچھا لطیفہ سن لیتے تھے تو اپنے کالم میں آخر میں اسے چھاپ دیتے تھے اور یہ صراحت بھی ضرور کر دیتے تھے کہ یہ لطیفہ انہیں کس نے سنایا تھا یا کس نے بھیجا تھا۔ چنانچہ انہوں نے میرے سنائے ہوئے لطیفے کو بھی اپنے کالم میں نہایت اطمینان سے چھاپا اور یہ صراحت کر دی کہ یہ لطیفہ مجتبیٰ حسین کا سنایا ہوا ہے اور اس کے راوی ہاشم علی اختر، وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہیں۔ ان کے کالم کے حوالے سے یہ لطیفہ اتنا مقبول ہوا کہ بعد میں لطیفوں کی کئی کتابوں میں شامل ہونے کے علاوہ ریڈرس ڈائجسٹ میں بھی شائع ہوا اور ہاشم علی اختر کو اس لطیفہ کی رائلٹی بھی ملتی رہی۔

ان کی حس مزاح بہت تیز تھی اور وہ اس کا استعمال جابجا کرتے رہتے تھے۔ ۸۰ کی دہائی کے آغاز میں جب ماروتی کمپنی نے اپنی نئی کار بنائی تو اس کی پانچ ابتدائی موٹر گاڑیوں کی ایک کھیپ دہلی روانہ کی گئی۔ان دنوں خوشونت سنگھ پارلیامنٹ کے رکن تھے لہٰذا ایک گاڑی بہ حیثیت رکن پارلیمنٹ اور صحافی خوشونت سنگھ کی خدمت میں بھی پیش کی گئی۔ان دنوں ملک میں امبیسڈر اور فیٹ گاڑیوں کا چلن عام تھا اور ماروتی جیسی ہلکی پھلکی اور چھوٹی گاڑیوں کا چلن ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ خوشونت سنگھ اپنی گاڑی خود چلاتے تھے۔انہیں تحفہ میں ماروتی گاڑی ملنے کی اطلاع اخبار میں آچکی تھی لہٰذا میں نے انہیں مبارکباد دی تو سرخوشی کے عالم میں کہنے لگے۔ مجتبیٰ کمال کی گاڑی ہے۔تم آج شام 'ہندوستان ٹائمس' کے دفتر پر آجاؤ۔ میں اس گاڑی میں تمہیں سیر کراتا ہوں۔کیا گاڑی ہے، رفتار ہرن کی سی ہے۔ملائم اتنی ہے کہ لگتا ہے کہ آپ مکھن کے بگولے میں سفر کر رہے ہیں۔ غرض ماروتی گاڑی کو چلا کر وہ نہال اور باغ باغ ہو گئے تھے۔حسب الحکم میں شام میں ان کے دفتر گیا تو انہوں نے ماروتی گاڑی میں میری جی بھر کے سیر کرائی۔تب پتہ چلا کہ مکھن کا بگولہ کسے کہتے ہیں۔بہرحال وہ ہفتہ دس دن تک وہ ماروتی گاڑی کے نام کی ہی مالا جپتے رہے۔ اسی اثنا میں ایک شام میں ان کے یہاں پہنچا تو دیکھا کہ نہایت دل برداشتہ اور غمگین بیٹھے ہیں۔ وجہ پوچھی تو بولے: مجتبیٰ! آج چھوٹی سی ٹریجڈی ہو گئی کہ میں پارلیمنٹ میں اپنی ماروتی گاڑی جہاں کھڑی کرتا ہوں وہاں ایک قوی ہیکل بندر نے آج میری گاڑی کی چھت پر اس زور سے چھلانگ ماری کہ گاڑی کی چھت کسی قدر دب گئی۔اسی افسوس میں بیٹھا ہوں۔(جو لوگ دہلی سے واقف نہیں ہیں ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ پارلیمنٹ اور راشٹرپتی بھون سے ملحق علاقہ میں نہایت قوی الجثہ اور دیوہیکل بندر پائے جاتے ہیں) ظاہر ہے کہ مجھے بھی اس اطلاع سے دکھ پہنچا تاہم اس کے ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلا کہ ماروتی گاڑی بہترین ہونے کے باوجود کتنی نازک اندام اور ہلکی پھلکی ہے۔تاہم میں اس وقت خوشونت سنگھ کی غمگینی کو خوش دلی میں تبدیل کرنے کے موڈ میں تھا لہٰذا میں نے کچھ وقفہ کے بعد ان سے کہا: خوشونت جی! آپ کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ آپ کی گاڑی کی چھت کسی بندر کے چھلانگ مارنے کی وجہ سے دب گئی ہے جب کہ میں جانتا ہوں کہ یہ چھت کس وجہ سے دب گئی ہے؟ بڑے اشتیاق سے پوچھا: ذرا بتاؤ تو سہی کہ کیوں دب گئی ہے؟ میں نے کہا: حضور! یہ آپ ہی کی غلطی ہے کہ آپ اپنی گاڑی ایک نہایت پرانے درخت کے نہایت گھنے سائے کے نیچے پارک کرتے ہیں۔یہ سایہ اتنا بھاری بھرکم ہے اور وزن دار ہوتا ہے کہ اس کے بوجھ تلے ماروتی گاڑی تو کجا امبیسڈر بھی آجائے تو اس کی چھت دب کر سپاٹ ہو جائے۔اس بات پر خوشونت سنگھ نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہا: مجتبیٰ! تسی کمال دی گل کیتی اے (خوشونت سنگھ بسا اوقات روانی میں مجھ سے پنجابی میں بھی گفتگو کر لیتے تھے اور میں بھی حتیٰ الامکان انہیں پنجابی میں ہی جواب دیا کرتا تھا) بعد میں انہوں نے میرے اس تبصرے کو میرے ہی حوالے سے

پارلیمنٹ اور صحافی حلقوں میں اتنا مقبول کیا کہ مجھے بالآخران سے گزارش کرنا پڑی کہ وہ اسے مزید مقبول نہ کریں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ماروتی کمپنی میرے خلاف ہرجانے کا دعویٰ نہ دائر کر بیٹھے۔

ایک دن خوشونت سنگھ نے مجھ سے کہا: آج میں نے پارلیمنٹ میں تمہارے حیدرآباد کے رکن پارلیمنٹ سید رحمت علی کی اردو تقریر سنی۔ کیالاجواب مقرر ہیں، کیا تم انہیں جانتے ہو؟ میں نے کہا، رحمت علی مجھے بہت عزیز رکھتے ہیں اور وہ میرے عزیز ترین بزرگ دوستوں میں سے ہیں۔ بولے، ایسی بات ہے تو ایک دن رحمت علی کو میرے گھر لے آؤ۔ چنانچہ دو تین دن بعد میں رحمت علی کو لے کر ان کے گھر گیا۔ بہت خوش ہوئے۔ جیسا کہ آپ میں سے بہت سوں کو پتہ ہوگا کہ جہاں رحمت علی پان کھانے کے شوقین تھے وہیں خوشونت سنگھ بھی پان کھانے کے معاملے میں کسی سے کم نہیں تھے۔ رحمت علی کا تو یہ حال تھا کہ وہ ہمیشہ پان کا ڈبہ اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے اور وقفہ وقفہ سے اپنے ہاتھوں سے پان کر بیڑا بنا کر نہ صرف خود کھاتے تھے بلکہ پان کے بیڑے اہل محفل کی خدمت میں بھی پیش کرتے تھے۔ غرض رحمت علی سے ان کی ملاقات نہایت گرم جوشانہ رہی۔ ایک مرحلہ پر رحمت علی نے عادت کے مطابق پان کا بیڑہ بنا کر خوشونت سنگھ کی خدمت میں پیش کیا تو اسے منہ میں رکھتے ہی خوشونت سنگھ نے برجستہ کہا: مجتبیٰ! رحمت علی جتنی اچھی تقریر کرتے ہیں اتنا ہی اچھا پان کا بیڑا بنانے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ بھئی کمال ہے۔ اس طرح پارلیمنٹ میں رحمت علی اور خوشونت سنگھ کی دوستی پروان چڑھنے لگی۔ ایک دن رحمت علی کا ذکر آیا تو مجھ سے کہنے لگے: پارلیمنٹ اس ملک کے کتنے مسائل حل کرتی ہے اس کے بارے میں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا تاہم رحمت علی کی وجہ سے پارلیمنٹ میں میرے پان کھانے کا مسئلہ ضرور حل ہوگیا ہے۔

ایک واقعہ میں زندگی بھر بھلا نہ سکوں گا۔ ایک دن صبح ان کا فون آیا، کہنے لگے، آج شام میرے گھر پر آجاؤ۔ میں نے کہا، آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ آج مجھے دن میں این سی ای آر ٹی کی ایک کتاب کی طباعت کے سلسلے میں دہلی کے مضافات میں واقع غازی آباد کے ایک پریس میں جانا ہے۔ دفتر کی گاڑی میں جارہا ہوں۔ دن بھر مصروف رہوں گا۔ جیسے ہی کام ختم ہوگا، دوڑا دوڑا آپ کے پاس آجاؤں گا۔ بولے، کبھی بھی آؤ مگر آؤ ضرور۔ میں دن بھر کتاب کے فائنل پروف پڑھنے میں اتنا مصروف رہا کہ دنیا کی خبروں سے بالکل بے نیاز ہی رہا۔ شام کو جیسے ہی کام ختم ہوا، میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے جلد از جلد سجان سنگھ پارک پہنچادے۔ میں ان کے گھر میں داخل ہوا تو سارے گھر کا ماحول اجنبی اور بدلا بدلا سا لگا۔ خوشونت سنگھ اپنے مخصوص صوفے پر چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے حسب معمول اپنی پاٹ دار آواز میں نہ تو السلام علیکم کہا اور نہ ہی مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میں تاڑ گیا کہ ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ میں بھی چپ چاپ جا کر ان کے مقابل والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے خوشونت سنگھ کو غور سے دیکھا۔ اس وقت ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا، کیا ہوا ہے؟ خوشونت سنگھ نے رندھی رندھی آواز میں کہا، تم شاید دن بھر مصروف رہے۔ اس لئے تمہیں پتہ نہ چل سکا کہ آج دوپہر میں امرتسر میں 'گولڈن ٹیمپل' پر سے بھنڈاروں والے کے قبضہ کو برخاست کرنے کے لئے انڈین ملٹری نے گولڈن ٹیمپل پر ہلہ بول دیا ہے اور آپریشن بلو اسٹار جاری ہے۔ سکھوں کی سب سے مقدس عبادت گاہ پر فوجی حملے کی اس اطلاع کو پا کر میں مبہوت سا رہ گیا۔ انہیں دلاسہ دیتا بھی تو کیا دیتا۔ وہاں سے اٹھ کر میں بیگم خوشونت سنگھ سے ملنے کے ارادے سے دالان میں گیا تو دیکھا کہ وہ بھی اداس اور گم صم بیٹھی ہیں۔ کچھ دیر وہاں بیٹھ کر میں پھر خوشونت سنگھ کے کمرے میں چلا آیا وہ بدستور خاموش تھے۔ البتہ ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں انہیں کچھ کہتا بھی تو کیا کہتا۔ اسی مخمصے میں کافی دیر بیٹھے رہنے کے بعد جب میں نے ان سے جانے کی اجازت مانگی تو انہوں نے بیٹھے بیٹھے گلوگیر آواز میں ایک نہایت انوکھی اور بلیغ بات کہی۔ کہنے لگے، 'مجتبیٰ! مجھے اس ملک میں اقلیت میں تبدیل ہوئے ابھی صرف چند گھنٹے ہی گزرے ہیں اور اقلیت بننے کا یہ کربناک احساس میرے لئے ناقابل برداشت ہو رہا ہے۔ تم لوگ تو پچھلی کئی دہائیوں سے اقلیت کا حصہ بن کر رہ رہے ہو۔ مجھے تم لوگوں کی قوت برداشت، صبر اور حوصلے پر رشک آرہا ہے۔ خدا حافظ۔' افسوس کہ ایسی اچھوتی، انوکھی اور بلیغ باتیں کرنے والا ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔

ایک سال پہلے مجھے دہلی جانے کا موقع ملا تو دوستوں نے بتایا تھا کہ خوشونت سنگھ اب لوگوں سے کم ہی ملتے ہیں۔ البتہ شام میں پانچ بجے سے چھ بجے کے درمیان ان سے فون پر بات ہوسکتی ہے۔ میں نے شام میں ان کے گھر فون کیا تو انکے ملازم نے فون اٹھایا۔ میں نے پوچھا: صاحب سے بات ہوسکتی ہے؟ ملازم نے پوچھا: آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے نام بتایا تو کچھ وقفے کے بعد جواب آیا: اگر آپ حیدرآباد والے مجتبیٰ حسین ہیں تو صاحب کہہ رہے ہیں آپ آج ہی شام میں کسی بھی وقت ضرور گھر پر آجائیں۔ میں گھر گیا تو کمزوری کے باوجود بڑی گرم جوشی سے ملے۔ کہنے لگے، مجتبیٰ! تمہیں اجازت لینے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ تم تو جانتے ہو کہ تمہارے لئے میرے گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے ہیں۔ آبدیدہ سے ہوکر بغلگیر ہو گئے۔ ان کے بیٹے راہل بھی اس وقت ان کے ساتھ تھے۔ ایک گھنٹے ان کی صحبت میں گزرا۔ حسب معمول ہنستے ہنساتے رہے، مایوسی کی باتیں تو نہیں کیں البتہ مضمحل دکھائی دئے۔ کسے پتہ تھا کہ یہی ملاقات خوشونت سنگھ سے آخری ملاقات ثابت ہوگی۔ خوشونت سنگھ اپنی گرم جوشی اور والہانہ سلوک کے باعث ہمیشہ یاد آتے رہیں گے۔

❑❑❑

اردو کا آخری قاری

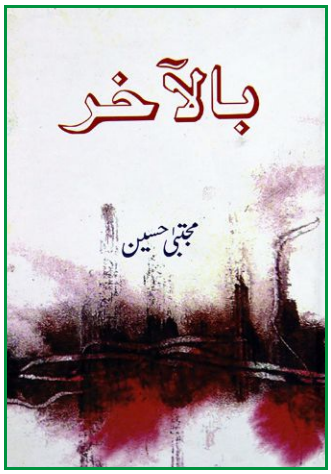

پھر یوں ہوا کہ ۲۰۰۰ء عیسوی گزر گئی تو لوگوں نے بیسویں صدی سے صاف بچ کر نکل جانے اور اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی خوشی بہت دھوم دھام سے منائی۔ اردو کے شاعر و ادیب بھلا اس خوشی میں کیسے شریک نہ ہوتے۔ وہ تو خوشی منانے کے معاملے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ دوسرے کی بھی شادی ہو تو ایک عدد سہرا لکھ کر اس کی خوشی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہم نے اردو زبان کے سوائے کسی اور زبان کے شاعر کو دوسرے کی شادی پر اس قدر والہانہ انداز میں خوش ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہمارا ایمان ہے کہ شادیوں میں اتنی آمد نہیں ہوتی جتنی کہ سہرے میں ہوتی ہے۔ شادیاں اتنی فی البدیہہ نہیں ہوتیں جتنے کہ سہرے فی البدیہہ ہوتے ہیں۔

شادی تو خیر پھر بھی شادی ہے آدمی میں ظرف ہو تو وہ دوسرے کی شادی پر بھی خوش ہو سکتا ہے مگر ہم نے بعض باکمال شاعروں کو دوسروں کے بچوں کی بسم اللہ پر شعر و سخن کے دریا بہاتے ہوئے دیکھا ہے۔ ادب کا ایسا بے جا مصرف کسی اور زبان میں دیکھنے کو نہیں ملا۔ غرض اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے بھی اکیسویں صدی کے خیر مقدم کے لئے بے پناہ نظمیں کہیں اور ایک دوسرے کو لہک لہک کر سنائیں مگر ایک منچلے شاعر نے اردو ادیبوں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اکیسویں صدی کی آمد کی خوشی ہمیں اپنے قارئین کے سامنے منانی چاہئے۔ بات معقول تھی مگر نہایت نامعقول وقت پر کہی گئی تھی۔ اردو کے شاعر اور ادیب پہلے تو بغلیں جھانکنے لگے کیونکہ اردو محاورے کے مطابق جھانکنے کے لئے بغل سے زیادہ کوئی اور موزوں جگہ نہیں ہوتی۔ بغلوں میں قاری نہ ملا تو بولے، یہ کون سی بڑی بات ہے۔ جب ہم اردو میں ادب عالیہ کی تخلیق کر رہے ہیں تو ہمارا کوئی قاری بھی ہوگا، کہیں نہ کہیں کوئی ہمارا کلام بھی پڑھتا ہوگا، ہم اپنے قاری کو جلد ہی تلاش کر لیں گے۔

پھر ہر ادیب و شاعر نے اپنے اپنے علاقہ میں قاری کی تلاش شروع کر دی۔

ایک راہ گیر سے پوچھا: کیوں بھئی! کیا آپ اردو کے قاری ہیں؟

راہگیر بولا: یہ قاری کیا چیز ہوتی ہے جی؟

بھئی پاٹھک، پاٹھک کو قاری کہتے ہیں یعنی پڑھنے والا۔

راہگیر بولا: اوہ! آئی سی، آپ کون سی صدی کی بات کر رہے ہیں۔ سنتے ہیں بیسویں صدی میں اردو نام کی کوئی زبان بھی تھی۔ میرے دادا اس زبان کے شاعر تھے۔ اپنا غیر مطبوعہ کلام میرے والد کو سونپ گئے تھے کہ بیٹا اس کلام کو محفوظ رکھنا، میں نے اس میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ یہ کلیجہ پچھلے برس تک میرے پاس تھا۔ پھر میری بیوی نے اسے ردّی والے کے ہاتھوں فروخت کر دیا اور اس طرح میرے دادا جان مرحوم کے کلام کی رائلٹی وصول کر لی۔ چند دن اور گزر جاتے تو اسے دیمک چاٹ جاتی اور یہ رائلٹی بھی نہ ملتی۔

پھر ایک چور سے پوچھا: کیوں بھئی! کیا تم اردو پڑھتے ہو؟

چور بولا: اردو شریفوں کی زبان رہی ہے۔ اس سے ہمارا کیا تعلق؟ یوں بھی اردو کے ذریعہ تالے توڑے جا سکتے ہیں اور نہ ہی نقب لگایا جا سکتا ہے۔

ایک تاجر سے پوچھا: لالہ جی! کیا آپ اردو پڑھتے ہیں؟ تاجر بولا: دیکھو جی! ہم بزنس مین ہیں، کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے۔ ہم صرف منافع کی زبان جانتے ہیں۔ اردو پڑھنے سے اگر ہمیں چار پیسے کا منافع بھی ہوتا تو ہم اسے ضرور پڑھتے۔

ایک اور شخص سے پوچھا: کیوں جناب! کیا آپ اردو جانتے ہیں؟

وہ بولا: میں تو نہیں جانتا، البتہ میرے گھر میں ایک طوطا ہے جو بہت اچھی اردو جانتا ہے۔ آپ میرے گھر آئیں تو کہے گا: مہربان، آداب عرض ہے، تشریف لائیے، زہے نصیب!

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اچھا آپ کا طوطا سخن فہم بھی ہے۔ کیا یہ شعر اسے آپ نے سکھایا ہے؟

وہ شخص بولا کہ میں کیا جانوں کی شعر کیا ہوتا ہے؟ اصل میں میرے دادا کے پاس ایک طوطا تھا جسے مذکورہ بالا اردو آتی تھی۔ اس کے بعد ہمارے گھر میں جتنے طوطے آئے وہ اردو سیکھتے گئے۔ طوطوں کے پاس یہ اردو نسلاً بعد نسلٍ آئی ہے۔

'آپ نے اردو کیوں نہیں سیکھی؟'

'میں پرندوں کی بولیاں سیکھنے کو ضروری نہیں سمجھتا'

ایک اور شخص سے پوچھا گیا: کیا آپ اردو جانتے ہیں؟

وہ بولا: میں اردو سیکھنا تو چاہتا تھا مگر مجھے معلوم ہوا کہ اردو بڑی میٹھی زبان ہے اور مجھے شوگر کی بیماری ہے۔ ڈاکٹروں نے میٹھی چیزوں سے پرہیز بتایا ہے۔ اس لئے اردو سے بہت دور رہتا ہوں۔

عام لوگوں سے مایوس ہو کر اردو کے شاعر و ادیب اردو کے ایک مرحوم نقاد کے بیٹے کے پاس گئے اور کہنے لگے:

بھئی تمہارے والد بزرگوار تو اردو کے پروفیسر اور نقاد تھے، وہ اردو کی بقا کے لئے ایک انجمن بھی چلاتے تھے، تم اردو ضرور جانتے ہو گے؟

نقاد کے بیٹے نے کہا: بھیا! کیوں میرے والد کی روح کو تکلیف پہنچاتے ہو۔ وہ اردو کے نقاد تھے ضرور مگر صرف اس لئے اردو کے نقاد تھے کہ انہیں کوئی دوسری زبان نہیں آتی تھی ورنہ کون اس زبان میں تنقید لکھتا۔ رہی اردو کی بقا کے لئے انجمن چلانے کی بات تو بھیا پیٹ بڑا بدکار ہے، شرافت کی زندگی گزارنے کے لئے آدمی کو بہت سے دھندے کرنے پڑتے ہیں۔ میرے والد نے صرف انجمن چلائی تھی، کسی کی جیب تو نہیں کاٹی تھی۔ اگر وہ انجمن نہ چلاتے تو میری تین بہنوں کی شادیاں اس قدر دھوم دھام سے کون کرتا؟

نقاد کے بیٹے سے پوچھا گیا: کیا تمہارے والد مرحوم نے تمہیں اردو نہیں سکھائی تھی؟

جواب ملا: میرے والد دوسروں کے لڑکوں کو اردو ضرور پڑھایا کرتے تھے لیکن ذرا سوچئے وہ خود اپنی اولاد کے ساتھ ایسی زیادتی کیسے کر سکتے تھے۔ اسی اردو سے بچنے کے لئے انہوں نے مجھے انگلینڈ بھیجا تھا۔ میرے والد بڑے دور اندیش آدمی تھے۔ اردو کی خدمت اس ڈھنگ سے کرتے تھے کہ بھلے ہی اردو تباہ ہو جائے لیکن خاندان پر کوئی آنچ نہ آئے۔ نتیجہ میں آج ہمارا خاندان دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے اور اردو کا حشر دیکھئے کیا ہو چکا ہے؟

◆◆◆◆

چراغ تلے اندھیرے کو دیکھ کر ادیب پریشان ہو گئے۔ انہوں نے فوراً ایک میٹنگ بلائی تا کہ اس نازک صورت حال پر غور کیا جا سکے۔ جلسے کے صدر نے گلوگیر آواز میں کہا:

بھائیو! آج ہم ایک عجیب و غریب صورت حال سے دوچار ہیں۔ ہمارے پاس ساز تو ہے پر آواز نہیں۔ آگ تو ہے مگر دھواں نہیں، پھول تو ہے مگر خوشبو نہیں۔ ہوا تو ہے مگر طوفان نہیں، سمندر تو ہے مگر قطرہ نہیں، دل تو ہے مگر دھڑکن نہیں۔ غم تو ہے مگر آہ نہیں...

اس پر کسی نے پکار کر کہا: قبلہ! یہ شاعری تو ہے مگر تقریر نہیں۔ صاف صاف بتائیے کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

صدر جلسہ نے کہا: بھائیو! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم برسوں سے شعر کہہ رہے ہیں اور آج ہمیں پتہ چل رہا ہے کہ ہمارے کلام بلاغت نظام کو پڑھنے والا کوئی نہیں۔ ہم برسوں سے ایک دوسرے کو کلام سنا کر خوش ہو رہے ہیں۔ ہمیں وہ قاری چاہئے جو خود شاعر و ادیب نہ ہو۔ ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی زبانوں کے پاس قاری موجود ہیں لیکن قاری نہیں ہیں تو صرف اردو کے پاس۔ ہمیں فوراً اپنے قاری کو تلاش کرنا چاہئے۔

اس پر ایک ادیب نے تجویز پیش کی: ہمیں فوراً حکومت سے مطالبہ کرنا چاہئے کہ وہ ہمارے شعر اور افسانے پڑھنے کے لئے چند اردو قاریوں کا تقرر کر

دے۔ان قاریوں پر یہ ذمہ داری عائد کردی جائے کہ وہ روزانہ پابندی سے دفتر آئیں اور آٹھ گھنٹے ہماری شاعری اور افسانوں کا مطالعہ کریں۔ یوں بھی ادھر کئی برسوں سے ہم اردو کے معاملہ میں حکومت کی طرف دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اردو اکیڈمیوں کی امداد سے ہم کتابیں چھاپتے رہے ہیں، ان کتابوں پر انعام لیتے رہے ہیں۔ جب حکومت نے ان کتابوں کی اشاعت کا بندوبست کیا ہے تو حکومت کا یہ فرض بن جاتا ہے کہ وہ ان کتابوں کے پڑھنے کے لئے قاریوں کا انتظام بھی کرے۔ اگر حکومت ہمارے مطالبہ کو تسلیم نہیں کرتی تو ہم اس کے خلاف نظمیں کہیں گے، افسانے لکھیں گے اور حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔

ایک شاعر نے کہا: بھائیو! اب ہماری اینٹ سے اینٹ صرف محاورے میں ہی بج سکتی ہے لہٰذا ہمیں اپنے طور پر قاری کو تلاش کرنا چاہئے۔ سرکاری قاری ہمارے ادب کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے گا۔ وہ ہمارے ادب کو بھی دفتر کی فائل بنا دے گا۔

بہت غور وفکر کے بعد یہ طے ہوا کہ اردو کے قاری کی تلاش کے لئے ہندی اور انگریزی اخباروں میں اشتہار دئے جائیں۔ اردو جریدوں میں اشتہار دینے کا سوال اس لئے پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ان کو صرف شاعر اور ادیب ہی پڑھتے تھے۔ چنانچہ دوسرے ہی دن اخباروں میں حسب ذیل اشتہار چھپا۔

'اردو کے قاریو! تم کہاں ہو؟'

ہم اردو کے شاعر و ادیب اس بات سے بہت دکھی ہیں کہ تم ہم سے روٹھ کر چلے گئے ہو۔ اگرچہ ہمیں پتہ نہیں کہ تم کب روٹھ کر چلے گئے۔ ہم شعر و شاعری میں اس قدر مصروف رہے کہ تمہارے جانے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ بھلے آدمی، کوئی اس طرح روٹھ کر چلا جاتا ہے۔ جانے سے پہلے بتا تو دیا ہوتا۔ یوں چوروں کی طرح جانے کی کیا ضرورت تھی؟ چاہے کچھ بھی ہو ہم تمہارے جانے سے بہت دکھی ہیں۔ کھانا تو ہم پہلے بھی نہیں کھاتے تھے۔ تمہارے غم میں ادھر ایک ہفتہ سے کسی شاعر نے ایک شعر بھی نہیں کہا ہے۔ تم اس اشتہار کو دیکھتے ہی فوراً چلے آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے۔ تمہیں کچھ بھی نہیں کہا جائے گا۔ اگر واپسی کا کرایہ نہ ہو تو ہمیں لکھ کر بھیجو، ہم اردو اکیڈمی کی طرف سے تمہارے لئے واپسی کا کرایہ بھیج دیں گے۔ پیسے کی فکر نہ کرو۔ اکیڈمی کے بجٹ کی بڑی رقم ہر سال Lapse ہو جاتی ہے۔ تم اردو ادب کی آبرو ہو، تم اردو کی آخری شمع ہو۔ تم اردو کی مانگ کا سندور ہو۔

نوٹ: اگر کوئی شخص اردو قاری کا پتہ بتائے تو اسے اردو اکیڈمی کی طرف سے منھ مانگا انعام دیا جائے گا اور اردو ادب کی اس عظیم خدمت کے صلے میں اس کا نام اردو ادب کی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ یوں بھی اردو ادب کی تاریخ لکھنے کے لئے ہمارے پاس عموماً سنہری روشنائی کا ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

اشتہار چھپنے کے بعد کئی دنوں تک نہ قاری آیا اور نہ ہی کوئی اطلاع آئی البتہ پندرہ دن بعد ایک مخبر کا خط انڈمان سے آیا کہ اردو کا ایک قاری یہاں موجود ہے۔ خبردار کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ اس بات کو راز میں رکھا جائے۔ اگر اسے پہلے سے معلوم ہو جائے گا کہ آپ حضرات اسے لینے کے لئے آرہے ہیں تو وہ بھاگ جائے گا۔ اب وہ بڑی خوشحال زندگی گزار رہا ہے کیونکہ اب وہ اردو نہیں پڑھتا۔ میں اس پر نظر رکھتا ہوں اور ہاں! آتے ہوئے میرا انعام بھی لیتے آیئے جو کہ آپ کے اشتہار کے مطابق منھ مانگا ہوگا۔ پہلے آپ اپنے قاری کو دیکھ لیں اور اس کے بعد مجھے انعام دیں۔

◆◆◆◆

اس اطلاع کا ملنا تھا کہ اردو ادیبوں اور شاعروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خوشی کی لہر کیسے نہ دوڑتی، آخر انہیں ان کا قاری جو مل گیا تھا۔ شاعروں نے اپنی غزلوں کو مانجھنا اور افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کو چمکانا شروع کر دیا۔

طے یہ کیا گیا کہ اردو شاعروں اور ادیبوں کا ایک وفد چپکے سے انڈمان جائے اور اپنے قاری کو سمجھا بجھا کر لے آئے۔ چنانچہ ایک رات اردو کے کچھ ادیب و شاعر پیٹھوں پر اردو کے عصری ادب کو لادے جزیرۂ انڈمان کی دھرتی پر اتر گئے۔ مخبر پہلے سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں وفد کے ارکان دبے پاؤں اردو کے آخری قاری کے گھر پہنچے۔ وہ اپنے گھر میں میٹھی نیند سو رہا تھا۔

مخبر نے کہا، بھائیو! اس مکان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لو۔ آپ کا قاری اور میرا انعام بچ کر نہ جانے پائے۔

شاعروں اور ادیبوں نے قاری کے گھر کے آگے عصری ادب کو اس طرح رکھ دیا کہ قاری اپنے گھر سے باہر نہ نکلنے پائے۔ صبح ہوئی تو قاری نے دیکھا کہ وہ اردو ادیبوں اور اردو ادب کے نرغے میں آچکا ہے۔

اس نے اندر سے پکار کر کہا: تم لوگ کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟

وفد کے لیڈر نے کہا: اے اردو کے آخری قاری! ہم اردو کے ادیب و شاعر ہیں۔ ہم بڑی دور سے تمہاری چوکھٹ پر آئے ہیں۔ قاری نے پکار کر کہا۔ اردو کے شاعر اور ادیبو! مجھے معلوم تھا کہ ایک دن تم میرے پاس ضرور آؤ گے۔ مگر پہلے میرے دروازے کے سامنے سے اردو ادب کو تو ہٹاؤ تاکہ میں باہر آسکوں۔

اردو ادب کو ہٹایا گیا تو قاری دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اس کے آنے کی دیر تھی کہ ایک شاعر نے لپک کر سلام عرض کیا اور کہا: حضور! توجہ چاہتا ہوں، مطلع عرض کیا ہے...

قاری پھر گھر کے اندر بھاگ گیا اور بولا: بھائیو! میں ادب کے اس اچانک حملے کو برداشت نہیں

کرسکوں گا۔ عرصہ ہوا کہ اردو شعر سننے کی پریکٹس چھوٹ چکی ہے۔ زبان کو 'مکرر' اور 'سبحان اللہ' کہنے کی عادت نہیں رہی۔

اس پر وفد کے لیڈر نے کہا: پیارے قاری! ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تمہیں غفلت میں شعر نہیں سنائیں گے۔ ہم تم سے ملنا چاہتے ہیں۔

قاری ڈرتا اور سہتا ہوا پھر باہر آ گیا۔ وفد کے لیڈر نے اسے اپنے سینے سے لگا کر کہا۔ پیارے قاری! تم ہم سے روٹھ کر کیوں چلے آئے۔ تمہیں ہمارے ساتھ واپس چلنا ہوگا۔ ہم تمہیں آرام سے رکھیں گے۔ ہم جنوں کی حکایت لکھتے رہیں گے اور تم اسے پڑھتے رہو۔

قاری بولا: بھائیو! میں برسوں تمہارے جنوں کی حکایت پڑھتا رہا مگر بعد میں اس حکایت سے شکایت ہونے لگی کہ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے دو ایک شاعروں سے شکایت بھی کی کہ تمہاری حکایت اب اتنی خونچکاں ہو چکی ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اب ادب میں ذات کے کرب کا اظہار ضروری ہو گیا ہے۔ میں نے شعر پڑھنا چاہا تو مجھے عجیب وغریب علامتیں دی گئیں۔ میں نے افسانہ پڑھنا چاہا تو نفسیات میرے آگے بڑھا دی گئیں۔ نظم پڑھنی چاہی تو تنہائی کا زہر میری ذات میں گھولا جانے لگا۔ ادب میں اتنے تجربے کئے گئے کہ ادب لیبارٹری میں تبدیل ہو گیا۔ ہر ادیب نے ادب کو ایک نیا موڑ دینا چاہا۔ چنانچہ ہمارا ادب اتنا مڑا تڑا ہو گیا کہ اسے دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ برسوں بعد کسی گھڑے میں سے نکالی ہوئی شیروانی کو دیکھ رہا ہوں۔ جب افسانے میں سے کہانی اور غزل میں سے شاعری غائب ہونے لگی تو میں نے دبی زبان میں آپ حضرات سے پھر شکایت کی۔ آپ نے فرمایا: اب ہم اپنے لئے شعر کہتے ہیں۔ قاری کے لئے نہیں کہتے۔ سو پندرہ سال پہلے ایک دن میں چپ چاپ اردو شعر و ادب کو چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ اب میں دوسری زبانیں سیکھ گیا ہوں۔ خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ آپ لوگوں کی آمد سے پتہ چلا کہ ہندوستان میں اب بھی اردو میں شعر کہے جا رہے ہیں اور افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ بڑے بے شرم لوگ ہیں آپ بھی۔

وفد کے لیڈر نے آہ بھر کر کہا: پیارے قاری! شعر اور افسانے لکھے تو جا رہے ہیں مگر انہیں پڑھنے والا کوئی نہیں ہے۔ جبھی تو ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ چلو اور وہ اردو ادب پڑھو۔ جسے ہم نے پچھلے پندرہ بیس برسوں میں لکھا ہے۔

ایک افسانہ نگار نے کہا: پہلے میرے افسانے پڑھو۔ صرف چھ مجموعے ہیں۔

ایک شاعر نے کہا: نہیں! پہلے میرا کلام پڑھو صرف دس مجموعے ہیں۔

پہلے شاعر نے کہا: نہیں! پہلے تمہیں میرا کلام پڑھنا ہوگا۔

دونوں شاعروں میں اس بات پر ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔ اسی افراتفری کا فائدہ اٹھا کر اردو کا آخری قاری بھاگ کھڑا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ پھر پتہ نہ چلا کہ اردو کا یہ آخری قاری کہاں چلا گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ مرا نہیں زندہ ہے اور سبھاش چندر بوس کے ساتھ ایک دن پھر ہمارے درمیان آئے گا۔ اردو شاعر اور ادیب اب بھی اس کی واپسی کی آس لگائے بیٹھے ہیں اور شعر کہے چلے جا رہے ہیں۔

❑❑❑

مجتبیٰ حسین کا وطن گلبرگہ ہے اور اتفاق دیکھئے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی برسوں گلبرگہ میں رہے۔ اس لحاظ سے شخصی طور پر ان کے مقروض تھے۔ مجتبیٰ نے دلی جا کر یہ پرانا قرض ادا کر دیا۔ (ہم سب سبکدوش ہوئے) مجتبیٰ حسین، محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ابراہیم جلیس کا قیام تو حیدرآباد میں زیادہ نہیں رہا لیکن محبوب حسین جگر تو ایک مرتبہ حیدرآباد آ گئے تو پھر کہیں گئے ہی نہیں۔ ان کا حیدرآباد میں مستقل قیام اور اس پر مستزاد حیدرآباد کی تہذیب (جس کا پنڈت نہرو بھی بار بار اپنی تقریروں میں ذکر کیا کرتے تھے) ان دونوں باتوں کی وجہ سے مجتبیٰ حسین جب تک شہر حیدرآباد میں رہے ان کا زیادہ تر وقت لوگوں کا ادب کرنے اور انہیں مودبانہ طور پر آداب عرض کرنے میں گزر گیا۔ وہ چھپ کر کسی گلی کوچے سے بھی گزرنا چاہتے تو وہاں بھی محبوب حسین جگر کا کوئی نہ کوئی شناسا انہیں ضرور مل جاتا۔ حیدرآباد میں ان دنوں سلام کے بجائے کسی کی طرف مسکرا کر دیکھنا یا ہاتھ ملا کر ہائے کہنا بہت معیوب تھا۔ سلام بھی بحر طویل میں ہوا کرتے تھے۔ (حوالے کے لئے ملاحظہ ہو مخدوم محی الدین کا مصرع)

تری نگاہ نے جھک کر مرے سلام لئے (بصیغۂ جمع)

مجتبیٰ حسین جب تک حیدرآباد میں رہے ان کی زندگی میں ایسے سخت مقامات قدم قدم پر آتے رہے اور غالباً، غالباً کیوں یقیناً یہی وجہ ہے کہ ان کے اندر کا مزاح نگار ۱۹۶۲ء تک باہر نہیں آ سکا۔ (میرے حساب سے مجتبیٰ حسین ۱۹۶۲ء تک ان کے محمد علی جوہر اس وقت کھلے جب انہوں نے روزنامہ سیاست کے لئے شیشہ و تیشہ لکھنا شروع کیا) شاہد صدیقی کے بعد مشہود اور مشاہدے سے وہی نبرد آزما ہوئے اور اس راہ میں شہید ہوتے ہوتے بچے۔ مطلب یہ کہ اگر وہ کالم نگاری سے ادب نگاری کی طرف مائل نہ آتے تو چھوٹی پڑی پر ہی رہتے۔ نقصان ان کا نہیں بڑی پٹڑی کا ہوتا اور ایک مرتبہ انہوں نے مزاح نگاری شروع کر دی تو پھر انہوں نے پلٹ کر پیچھے کی طرف نہیں دیکھا۔ پیچھے تو وہ لوگ دیکھتے ہیں جنہیں آگے بڑھنے میں کچھ تکلف ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری نے ایسے ایسے لوگوں کو مزاح پڑھنے اور سمجھنے پر مائل کیا جن سے کبھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ یہ شریفانہ رویہ اختیار کر سکیں گے۔ اب انہیں اندازہ ہوا ہے کہ وہ سابق میں کتنا نقصان اٹھاتے رہے ہیں۔

(یوسف ناظم)

مقدر

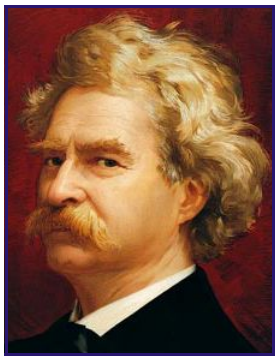

مارک ٹوئن

۱۸۳۵ء ۱۹۱۰ء

یہ ایک فینسی اسکیچ نہیں ہے۔ مجھے یہ ایک پادری سے حاصل ہوا جو چالیس سال پہلے وولوچ میں ٹرینر تھا اور صداقت میں مشہور تھا۔ اس نسل کے دو یا تین شاندار انگریزی سپاہیوں کے اعزاز میں لندن میں ڈنر کا انعقاد کیا گیا تھا۔ عصر حاضر میں نظر آنے والی چند وجوہات کے سبب میں اس کا نام اور اصلی عہدہ پوشیدہ رکھوں گا اور میں اسے لیفٹیننٹ جنرل لارڈ آرتھر اسکورسبی، وی سی، کے سی بی وغیرہ کے نام سے پکاروں گا۔ مشہور نام غضب کی قوت کشش کا حامل ہوتا ہے۔ کہتے ہیں تیس برس قبل اسے ہمیشہ کے لئے زندہ و پائندہ کرنے کی خاطر کریمین جنگ کے علاقہ سے اس کا نام اچانک مشہور ہوا جو اس دن سے اب تک ہزاروں مرتبہ میرے کانوں سے گزر چکا تھا۔ مجھے کھانے پینے کو دیکھنا تھا، اسکینگ، تلاش، اس کے چہرے پر موجود قوت کشش، اس کی ایمانداری جس سے وہ بھرا ہوا تھا۔ اس عظیم شخصیت کی مدہوشی، اس کو دیکھنے والی سیکڑوں آنکھوں کی مدہوشی، لوگوں کے دلوں سے نکل کر اس کی طرف جانے والی عمیق، محبت آمیز اور دلی محبت کی مدہوشی کو دیکھنا تھا۔ میرے بائیں جانب والا پادری میرا پرانا شناسا تھا۔ لیکن اب پادری ہے۔ جس نے اپنی زندگی کا نصف اول کیمپوں اور کھیتوں میں اور وولوچ میں فوج کے اسکول میں ٹرینر کے طور پر گزارا۔ اسی لمحہ جب میں اس سلسلہ میں محو گفتگو تھا، ایک پوشیدہ اور عجیب کی چمک اس کی آنکھوں میں تیر گئی۔ وہ نیچے جھکا اور رازدارانہ انداز میں مجھ سے کہا (ڈنر کے منتظم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے) اس کی عظمت فقط ایک اتفاق ہے۔ فقط ناقابل یقین قسمت کا ایک نتیجہ۔ یہ فیصلہ میرے لئے یقینا حیرت انگیز تھا۔ اگر نپولین، سقراط یا سولومن کے سلسلہ سے گفتگو ہوتی تو قطعی حیرت انگیز نہ ہوتا۔ کچھ دن بعد اس عجیب کمنٹ پر ایک وضاحتی بیان سامنے آیا اور اس معزز انسان نے مجھے بتایا۔ چالیس سال قبل میں وولوچ میں فوجی اکیڈمی میں ایک ٹرینر تھا۔ نوجوان اسکورسبی کے ابتدائی امتحان کے موقع پر میں موجود تھا۔ مجھے اس پر رحم آ رہا تھا کیونکہ کلاس کے سبھی طلاب نے اطمینان بخش اور خوبصورت جوابات دئے تھے لیکن وہ کچھ بھی نہ جانتا تھا لیکن مجھے نہ جانے وہ اتنا پیارا کیوں لگ رہا تھا۔ وہ ظاہری طور پر بہترین، بھولا بھالا اور پیارا سا تھا اس لئے اس کو وہاں ایک خاموش بت کی مانند کھڑے ہو کر تکنا اور حماقت اور جاہلیت سے پُر عجیب جوابات دیتے ہوئے دیکھنا نہایت دردناک منظر تھا۔ میرے اندر رحم کا سیلاب امنڈ پڑا۔ میں نے خود سے کہا، جب وہ دوبارہ امتحان کے لئے آئے گا تو اسے پیچھے کر دیا جائے گا اس لئے اس کے خاتمے کو بخیر کرنے کے لئے یہ رحم کسی طرح نقصان ثابت ہوتا تو نہیں دکھ رہا تھا۔

میں اسے ایک جانب لے گیا، میں نے معلوم کیا کہ وہ سیزر کے بارے میں کچھ معلومات رکھتا ہے اور اس کے علاوہ وہ کچھ نہیں جانتا لہٰذا میں کام پر چلا گیا اور میں نے اسے سیزر کے بارے میں اسٹاک میں سوالوں کے ایک پیراگراف پر نشان لگا دیا۔ آپ میرا یقین کریں تو امتحان والے دن وہ رنگین پرواز کے لئے پرتول رہا تھا۔ وہ پورے طور سے اسے رٹ رہا تھا۔ اس کو اس کے لئے تعریف بھی ملی جب کہ دوسرے لوگ جو اس سے ہزار گنا زیادہ جانتے تھے، تعریف سے محروم رہ گئے۔ عجیب نصیب والے اتفاق کی وجہ سے (جو شائد اس صدی میں دوبارہ نہ ہو) اپنے قواعد کے محدود دائرے سے باہر اس سے کوئی سوال بھی نہیں پوچھا گیا تھا۔ بس حیرت انگیز طور پر، اسی لطف و مہربانی کے ساتھ جو ایک ماں اپنے اپاہج بچے سے رکھتی ہے اور اس نے ہمیشہ خود کو بچایا۔ بلا شک و شبہ جو چیز سب سے زیادہ بے نقاب کرے گی اور آخر میں مار ہی ڈالے گی وہ ہے حساب (میتھ) میں نے اس کی موت کو آسان بنانے کا عہد لیا۔ اس لئے میں نے صرف ان سوالات کے جوابات اسے یاد کرائے جو ٹریز عام طور سے کر سکتا ہے اور پھر میں نے اسے اس کی قسمت پر چھوڑ دیا۔ محترم! نتائج کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میری تعجب خیز معلومات کے مطابق اسے پہلا انعام ملا اور بے انتہا تعریف۔ سو جاؤ! ایک ہفتہ سے زیادہ ہو گیا تھا، نیند غائب تھی۔ میں نے جو کچھ بھی کیا وہ صرف ایک رحم کے جذبے کے تحت تھا۔ میں نے اس بیچارے کو خاتمہ سے بچانے کے لئے ہی یہ کام کیا تھا۔ میں نے کبھی بھی ایسے ناقابل یقین نتائج کے بارے میں خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ جیسا کہ ہو چکا ہے۔ میں فرنک اسٹین کے پروڈیوسر کی طرح خود کو قصوروار اور بیچارہ محسوس کر رہا تھا۔ کریمیا کی جنگ اسی وقت شروع ہوئی تھی۔ یقیناً جنگ تو ہونا ہی تھی۔ میں نے خود سے کہا، ہم امن قائم نہیں کر سکے اور معلوم کرنے سے پہلے ہم اس گدھے کو مرنے کا موقع نہیں دے سکتے۔ میں نے زلزلے کا انتظار کیا۔ جب زلزلہ آیا تو مجھے چکر آنے لگے۔ وہ حقیقت میں ایک مرچنگ رجیمنٹ میں ایک گزیٹیڈ کپتان تھا۔ اس طرح کے عظیم درجہ پر فائز ہونے سے بہتر ہے کہ انسان خدمت کرتے کرتے بوڑھا ہو جائے اور یہ کون سوچ سکتا ہوگا کہ وہ ایسے غیر پختہ اور ناتجربہ کار کاندھوں پر ذمہ داری کا ایسا بوجھ ڈال دیں گے۔ میں نے اسے مشکل سے کھڑا کیا ہوتا اگر انہوں نے اسے صرف پرچم کشائی کی ذمہ داری دی ہوتی لیکن ایک کپتان۔ سوچو اس کے بارے میں، میں نے سوچا کہ اگر میں زیادہ سوچوں گا تو میرے بال سفید ہو جائیں گے۔ سوچو! میں نے کیا کیا۔ میں ایک غیر فعال اور آرام پرست انسان۔ میں نے خود سے کہا، اس کے لئے میں ملک کے تئیں ذمہ دار ہوں اور مجھے اس کے ساتھ جانا چاہئے اور جہاں تک ممکن ہو مجھے ملک کی حفاظت کرنا چاہئے۔ اس لئے میں نے اپنی تھوڑی جمع پونجی ہمراہ لی جسے میں نے بحرانی اقتصادی دور میں محفوظ کیا تھا اور میں ایک سانس میں اس کے ساتھ ہو گیا اور اس کی رجیمنٹ میں ہم دور کھیتوں میں چلے گئے۔ اور وہاں! سچ میں! خطرناک! غلطیاں؟! اس نے غلطیوں کے سوا کچھ اور کیوں نہ کیا۔ لیکن آپ دیکھیں کوئی بھی اس طرف متوجہ نہیں تھا۔ ہر انسان اس پر غلط توجہ دے رہا تھا اور اس کے غلط کاموں کی غیر ضروری تاویل کی جا رہی تھی۔ نتیجتاً انہوں نے اس کی احمقانہ غلطیوں اور صلاحیت اور حوصلہ افزائی کے طور پر لیا۔ اس کی چھوٹی غلطیاں بھی انسان کے دل کو رلا دینے کے لئے کافی تھیں۔ یہی میرے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ ذاتی طور پر غصہ اور مذمت بھی کی اور جس خطرے نے مجھے ہمیشہ پریشان کیا وہ یہ کہ اس کی ہر نئی غلطی اس کی عزت افزائی کرتی تھی۔ میں خود سے کہنے لگا کہ وہ اتنا اونچا جائے گا کہ جب وہ آخر میں سامنے آئے گا تو آسمان سے طلوع ہونے والے آفتاب کی مانند ہوگا۔ وہ سیڑھیاں چڑھتا رہا۔ اپنے سینئر افسران کے مردہ جسموں پر جب جنگ کے آخری لمحات میں ہمارا کرنل نیچے چلا گیا اور ہمارا کلیجہ منھ کو آ گیا کیونکہ اسکورسبی رینک میں دوسرا تھا۔ جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ معاون دستے مسلسل پیچھے ہٹ رہے تھے۔ ہماری رجیمنٹ نے ایک اہم مقام پر قبضہ کر لیا۔ تباہی اب بڑی بھول ہونا چاہئے۔ اس لمحہ میں یہ احمق رجیمنٹ کو اپنی جگہ سے ہٹانے کے علاوہ اور کیا کرتا ہے اور پڑوسی پہاڑی پر انچارج کو ایک حکم صادر کرتا ہے۔ میں نے خود سے کہا: تم وہاں جاؤ۔ آخر انجام تک پہنچ ہی گیا۔ اور ہم دور چلے گئے۔ جنگ کی تلاش کرنے اور اسے روکنے سے قبل ہم پہاڑی پر تھے۔ ہمیں کیا ملا؟ محفوظ مقام پر ایک مکمل اور غیر مشتبہ روسی فوج۔ اور کیا ہوا؟ ہمیں ختم کر دیا گیا؟ یہی وجہ ہے جو سو میں سے ننانوے معاملات میں ضرور ہوا ہوگا۔ لیکن نہیں! ان روسیوں نے بحث کی کہ ایسے وقت میں وہاں آس پاس کوئی بھی رجیمنٹ نہیں ہوگی۔ یہاں پوری انگریزی فوج ہونا چاہئے اور آخر کار چالاک روسیوں کے کھیل کا پتہ چلا اور قید کر لیا گیا۔ وہ ہکے بکے ہو کر پہاڑی پر سے نیچے کھیتوں میں دور چلے گئے اور ہم ان کے پیچھے۔ انہوں نے خود روس کا مرکز توڑ دیا اور کچھ ہی وقت میں دنیا کی سب سے خطرناک بھگدڑ مچ چکی تھی معاون دستوں کی شکست ایک شاندار فتح میں تبدیل ہو چکی تھی۔ مارشل کانروبرٹ نے تعریف اور خوشی کے ساتھ نظر اٹھائی فوراً باہر آ کر اسکورسبی کو گلے لگایا۔ فوج کی موجودگی میں اسے میدان میں سجایا اور اس وقت اسکورسبی کی غلطی کیا تھی؟ صرف اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کے لئے سمجھنا۔ اس کے پاس میدان چھوڑنے کے لئے اور ہمارے حقوق کی پیروی کرنے کے لئے حکم آیا اور اس کے بجائے وہ آگے گر گیا اور بائیں جانب پہاڑی پر چلا گیا۔ لیکن اس دن اپنی حیرت انگیز فوجی صلاحیت کے ساتھ دنیا بھر میں جو نام کمایا وہ عزت تاریخ کی کتابوں کی موجودگی میں کبھی کمزور نہیں ہوگی۔ وہ اتنا اچھا، پیارا اور سچا ہے جتنا ایک انسان ہو سکتا ہے لیکن وہ بارش میں اندر آنا نہیں جانتا۔ دن پر دن، وہ حیرت انگیز طور پر لگا ہوا ہے۔ نصف پیڑھی کے لئے وہ ہماری سبھی جنگوں میں چمکتا ہوا سپاہی رہا ہے۔ اس نے غلطیوں کے ساتھ اپنی فوجی زندگی کا کباڑا کر دیا ہے۔ اس کے سینے کو دیکھو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف گھریلو اور غیر ملکی ڈزائن کے کپڑے پہنے ہے۔ خیر! جناب! ان میں سے ہر ایک میں شور آمیز احمقانہ حرکتیں یا اس طرح کی باتوں کا ایک رکارڈ ہے اور ایک ساتھ ملا کر وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس دنیا میں سب سے بہترین چیز ہے خوش قسمت مرد کے طور پر جنم لینا۔

❑❑❑

ترجمہ: رائحہ تقوی

آدمی نامہ: ایک جائزہ

شمیم حنفی

B-114، ذاکر باغ
اوکھلا روڈ، نئی دہلی
رابطہ: 9818524803

مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں مزاح اور سنجیدگی کے روایتی فرق سے لاتعلقی کا بہت خاموش اظہار، سب سے زیادہ ان کے شخصی خاکوں میں ہوا ہے۔ وہ مزاح اور سنجیدگی کے فق سے نہ تو باضابطہ انکار کرتے ہیں نہ ہی اس سلسلے میں کسی طرح کی فلسفیانہ موشگافی سے کام لیتے ہیں مگر ان کا کوئی بھی خاکہ اٹھایئے اسے پڑھتے پڑھتے آپ کہاں، کس نقطے پر مزاح سے نکل کر سنجیدگی کے حدود میں داخل ہو گئے، اس کا احساس آپ کو اس وقت ہوتا ہے جب اچانک آپ کا اپنے ردِّعمل میں تبدیلی کی طرف دھیان چلا جائے۔

ایسا نہیں کہ مجتبیٰ حسین رسمی نوعیت کے مزاح نگاروں سے یکسر مختلف ہیں۔ فقرے بازی، لطیفہ سازی، زبان کے پینتروں، بہ ظاہر سیدھی سادی انسانی صورت حال میں مضحک، بے ڈول اور عجیب الوضع زاویوں کی تلاش سے مجتبیٰ حسین نے بھی بہت کام لیا ہے۔ یہ سب کے سب مزاح نگاروں کے آزمودہ بلکہ فرسودہ نسخے ہیں اور ان پر ضرورت سے زیادہ انحصار کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بعض مزاح کے ہاں مزاح کا عنصر بس سنے سنائے لطیفوں یا زبان و بیان کے فرسودہ ہتھکنڈوں کے استعمال تک ہے۔ اردو میں مزاح نگاروں کی مجموعی صورت حال ایسی نہیں جو کسی بھی لحاظ سے قابل قدر اور تشفی بخش کہی جا سکے، خاص طور پر ہندوستان میں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے بیشتر مزاح نگاروں کی ہر کوشش یا تو بہت مصنوعی Contrived اور از کار رفتہ ہوتی ہے یا پھر اتنی عام اور مانوس کہ اس پر کسی نئے شگفتہ لمحے کے انکشاف کا کوئی گمان نہیں ہوتا۔ اردو کے زیادہ تر مزاح نگار صف محدود معنوں میں مزاح نگار بنے رہنے پر قانع دکھائی دیتے ہیں۔ وہ مزاح کو کبھی سنجیدہ اور متین اور ملال آمیز فکر کے کسی موثر حربے کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

آر کے لکشمن نے ایک گفتگو میں کہا تھا کہ ہندوستان کے اکثر کارٹون سازوں کی خرابی بھی یہی ہے کہ وہ مضحکہ خیز ہستیوں اور مسخرے پن کے ساتھ بنائی گئی شکلوں کو کارٹون کا بدل سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اپنی خوش طبعی کے اظہار میں ان کا یقین اتنا پختہ ہوتا ہے کہ وہ اسی کو اپنے کارٹونسٹ ہونے کی دلیل کے طور پر برتنے لگتے ہیں اور کسی بڑے، زیادہ معنی خیز، زیادہ وسیع Perspective کی تلاش نہیں کرتے۔

مجتبیٰ حسین کے کئی خاکوں کو پڑھتے یا سنتے وقت مجھے اپنے احساسات میں ایک حرارت آمیز ابتری کا اور دھڑکنوں کی رفتار میں تیزی کا تجربہ ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ مجتبیٰ حسین بے تکلف اور

بے ساختہ انداز میں کسی شخصیت کا خاکہ باندھتے باندھتے اچانک سنجیدہ ہو جاتے ہیں اور تجزیے کی ان حدود میں جا پہنچتے ہیں جو ہمارے مزاح نگاروں کی اکثریت کے لئے ممنوعہ علاقے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کبھی کبھی تو مجتبیٰ حسین کے خاکوں میں قہقہوں اور آنسوؤں کی تمیز بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تبسم کے پردے میں ایک گہرے افسوس کو چھپانے کی وہ مستقل کوشش کر رہے ہیں اور اپنے قاری کو ماورائے بیان جانے کی دعوت دے رہے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے خاکوں کی کتاب 'آدمی نامہ' کے عنوان سے بھی افراد کی طرف ان کے بنیادی رویئے پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ کتاب کے ابتدائیے (دو باتیں) میں ان کا یہ اعلان شامل ہے:

'میں نے یہ خاکے کسی کے حق میں یا خلاف بالکل نہیں لکھے۔ جس طرح دل و دماغ نے کسی شخصیت کو قبول کیا، اسے ہو بہو کاغذ پر منتقل کر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ خاکے میں خاکہ نگار کا زاویۂ نگاہ بھی در آتا ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ خاکہ نگار جب کسی شخصیت کا خاکہ لکھتا ہے تو وہ انجانے طور پر خود اپنا خاکہ بھی لکھ ڈالتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ میں نے یہ سارے خاکے جو خود اپنا خاکہ لکھنے کی چاہ میں لکھے ہیں۔'

اگر چہ یہاں بھی ہنسی ہنسی میں مجتبیٰ حسین ایک گہرے رمز کی طرف اشارہ کر گئے ہیں، لیکن ان کی خاکہ نگاری کے مسائل بس اس ایک رمز تک محدود نہیں کہ دوسرے کے بہانے لکھنے والا آپ اپنی ہستی سے بھی کچھ پردے اٹھا دیتا ہے۔ یہ تو شاید افراد کے بارے میں افراد کے اظہار کا ایک مسلم اصول بلکہ اٹل قانون بن چکا ہے کہ جب ہم دوسروں کی بات کرتے ہیں تو بالواسطہ طور پر ہماری اپنی شخصیت بھی کھلتی جاتی ہے۔ فرد کی اپنی ہستی کا مفہوم دوسرے افراد کی ہستی کے سیاق میں ہی متعین ہوتا ہے۔ یہاں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خاکوں کی اس کتاب کا نام بھی خاکہ نگار کی بنیادی سرشت، گرد و پیش کی دنیا اور دیکھے بھالے افراد کی طرف اس کے رویے، انسانی رشتوں اور رفاقتوں کے تئیں اس کی فکر بلکہ اس کی مجموعی اخلاقیات، ان سب کی تفہیم میں ہماری مدد کرتا ہے۔ اس نام (آدمی نامہ) کی حیثیت ایک معروف و مانوس استعارے کی ہے جس کے معنی مقرر ہو چکے ہیں۔ ایک سمجھا بوجھا محاورہ ہو یا سویا ہوا استعارہ جس کے مفہوم کا تعین نظیر اکبر آبادی نے کر دیا تھا۔ اپنی اس بے مثال نظم میں نظیر نے اندھیرے اور اجالے، نیکی اور بدی، خیر اور شر، آدمی کا جوہر ہے، اس کا وجود نہیں۔ آدمی کا وجود تو اس کے بس آدمی ہونے سے عبارت ہے۔ محرومی اور کامرانی، خرابی اور خوبی کا ایک عجیب و غریب مجموعہ۔ نظیر نے اپنی نظم 'آدمی نامہ' میں آدمی کو عناصر کو اسی سطح پر رکھنے اور سمجھنے کی جستجو کی تھی جو اس کی بنیادی سطح ہے۔ جہاں وہ طرح طرح کے متضاد تجربوں سے گزرتا ہے۔ ایک ناقابل تقسیم وحدت کے طور پر اس کی اچھائیاں اور برائیاں، اس کی فتوحات اور ہزیمتیں یکساں طور پر اسے منکشف کرتی رہتی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آدمی کا اصل سفر ایک تسلسل ہے، بیک وقت سیاہ بھی ہے اور سفید بھی۔ پتہ نہیں مجتبیٰ حسین کے ذہن میں اپنی اس کتاب کا یہ نام کسی اتفاق کا نتیجہ ہے یا سوچے سمجھے انتخاب کا۔ واقعہ جو بھی ہو، یہ بات صاف ہے کہ ان تمام کرداروں کی طرف جو مجتبیٰ حسین کی توجہ کا نشانہ بنے ہیں، خود مجتبیٰ حسین کا رویہ بھی بڑی حد تک نظیر سے مماثلے۔ یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ مجتبیٰ حسین کے انتہائی دلچسپ خاکوں کو بھی مختلف شخصیات کے کارٹونوں سے تعبیر کرنا غلط ہوگا۔ کارٹون سازی بہر حال، ایک منفی اور تضحیک آمیز عمل ہے۔ اگر کسی کارٹون کا مقصد متعلقہ شخصیت کی مداحی یا اسی کے کسی کارنامے کا ہی بیانہو تو پھر اس مقصد میں اور پروپیگنڈے میں زیادہ فاصلہ نہیں رہ جائے گا۔ اسی طرح مجتبیٰ حسین نے بعض خاکوں میں غیر ضروری رواداری اور رسمی مروت سے بھی کام لیا ہے۔

لیکن یہ خاکے بھی روایتی قسم کے نثری قصیدوں سے کچھ مختلف ضرور ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی کتاب میں خواجہ عبدالغفور، نریندر لوتھر اور حسن الدین احمد کے خاکے۔ البتہ اس رسمی مروت کا نتیجہ یہ تو ہونا ہی تھا کہ ان خاکوں میں مجتبیٰ حسین کے کامیاب خاکوں کی خوبیاں دب کر رہ جائیں۔ سو ان خاکوں میں مجتبیٰ حسین بھی غیر دلچسپ دکھائی دیتے ہیں اور ان کے موضوعات بھی۔ اس کے برعکس راجندر سنگھ بیدی، مخدوم، عمیق حنفی اور باقی کے خاکے اپنے بسیط (Comprehensive) زاویہ نظر، اپنے ذہانت آمیز تجزیے اور شخصیات کے اوصاف اور خامیوں کی یکساں قبولیت کے سبب بہت جاندار اور متحرک نظر آتے ہیں۔ ان میں اول الذکر خاکوں میں جیسے ادھورے پن کا احساس نہیں ہوتا اور ان سے شخصیات کی بہت مفصل نہ سہی مگر ایک جامع تصویر ابھرتی ہے۔ ان میں مجتبیٰ حسین کی بصیرت بھی پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے اور ان کا مشاہدہ بھی۔ ان کا مزاح بھی اور ان کی متانت بھی۔ مثلاً:

'ان کی ذات 'جھپٹنے کا وقت' ہے۔ برسات کے موسم میں آپ نے کبھی یہ منظر دیکھا ہوگا کہ ایک طرف تو ہلکی سی پھوار پڑ رہی ہے اور دوسری طرف آسمان پر دھلا دھلایا سورج چھما چھم چمک رہا ہے۔ اس منظر کو اپنے ذہن میں تازہ کر لیجئے تو سمجھئے کہ آپ اس منظر میں نہیں، بیدیؔ صاحب کی شخصیت میں دور تک چلے گئے ہیں۔ ان کی ذات میں ہر دم سورج اسی طرح چمکتا ہے اور اسی طرح ہلکی سی پھوار پڑ رہی ہوتی ہے۔'

(راجندر سنگھ بیدی، سو ہے وہ بھی آدمی)

'مخدوم ایک انسان نہیں تھے، جیتا جاگتا، سانس لیتا ہوا شہر تھے۔ اس شہر کی ہم نے برسوں سیر

کی۔ ہم سب اسی شہر میں آباد تھے۔ اس شہر میں کتنی سڑکیں تھیں، کتنی گلیاں تھیں، کتنے موڑ تھے اور یہ سب راستے انسانیت اور سچائی کی طرف جاتے تھے۔'

(مخدوم محی الدین، یادوں میں بسا آدمی)

'ان کی تصویر کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آپ جزیرہ نمائے عرب کے نقشے کو دیکھ رہے ہوں بلکہ غور سے دیکھا جائے تو اس میں کہیں کہیں عرب کا صحرا بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ بالکل سپاٹ سا چٹانی اور کرخت چہرہ۔ ویسے اب بھی عمیق حنفی کے چہرے کے اس صحرا میں نخلستان کے اُگ آنے کے باوجود آپ ان کے چہرے کو دیکھیں تو نہ جانے کیوں جزیرۂ عرب کا خیال آجاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ داڑھی کے بغیر ان کا چہرہ عرب کے جغرافیہ سے قریب تھا اور اب داڑھی کے بعد یہ عرب کی تاریخ اور تمدن سے قریب ہوگیا ہے۔'

(عمیق حنفی، آدمی در آدمی)

'اصل میں باقی کے اندر جو شاعر بیٹھا ہوا ہے وہ ہر دم اپنی گردن اکڑائے رکھنا چاہتا ہے۔ چاہے ایسا کرنے سے اس کی گردن میں درد ہی کیوں نہ ہونے لگے۔ باقی کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اب وائٹ کالرڈ شاعر بھی پیدا ہونے لگے ہیں۔ اردو غزل میں مقطع کی ایجاد صرف اس لئے ہوئی تھی کہ شاعر اس میں حسب استطاعت اپنی تعریف و توصیف کرے لیکن باقی اپنی تعریف کے لئے مقطع کو ناکافی سمجھتے ہیں:

کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے
اسی لئے وہ عام نثری بات چیت میں بھی ہر دم مقطع ہی کہتے رہتے ہیں۔'

(باقی، نو آدمیوں کا آدمی)

ان اقتباسات میں مجتبیٰ حسین ایک عام فوٹو گرافر کے بجائے ایک ایسے مصور سے مماثل ہیں جو اپنا مخصوص رنگ رکھتا ہے جس کا مقصد اپنے مزاح سے لوگوں کو صرف محظوظ کرنا ہی نہیں، لوگوں کی بصیرت اور اپنی بصیرت میں ایک ربط قائم کرنا بھی ہے اور یہ سارا عمل مجتبیٰ حسین کے یہاں اتنا خاموش اور نیچرل ہوتا ہے کہ اس پر کسی انہونے یا بظاہر غیر معمولی واقعے کا گمان تک نہیں ہوتا۔ یہ میں نے شروع میں ہی عرض کیا تھا کہ مجتبیٰ حسین کی تحریر کا ایک قابل لحاظ وصف اس کی بے ساختگی اور اس کا فطری بہاؤ ہے۔ آورد سے گرانبار تحریر چاہے نثر و نظم کی کسی بھی صنف میں پل جائے مگر مزاح اور طنز کی سطح پر ایسی کوئی تحریر، دو چار قدم کی دوری بھی، پڑھنے والے کو بیزار کئے بغیر نہیں کر طے کر سکتی۔ ایسا نہیں کہ مجتبیٰ حسین آورد کی گرفت میں کبھی آتے ہی نہیں۔ اس ضمن میں، ایک بڑا خطرہ جو وہ اکثر مول لیتے رہتے ہیں، مصرعہ طرح پر غزل کہنے کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ فرمائش کا جبر کسی بھی نیچرل لکھنے والے کے لئے ایک سخت آزمائش ہے۔ اس آزمائش کی تکمیل میں اسے خواہ اپنی مشاقی کے بل بوتے پر ظاہراً کامیابی بھی مل جائے، مگر یہ کامیابی بہت دیر تک ساتھ نہیں دیتی۔ خاص طور پر مزاح اور اسٹیریوٹائپ میں توازلی بیر ہے۔ اردو کے اکثر مزاح نگار بالآخر اسی مرض کا شکار ہوئے۔

مجتبیٰ حسین کے بعض خاکوں میں ایک ہلکی سی پرچھائیں، کہیں کہیں تکرار کی دکھائی دیتی ہے مگر ان کے لہجے میں بے تکلفی اور ان کے تاثر کی رفتار میں تیزی اتنی ہے کہ وہ اس پرچھائیں کو رکاوٹ بننے نہیں دیتے۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں کہ اردو میں سب سے اچھے خاکے ان ادیبوں نے لکھے ہیں جن کے خاکوں کی تعداد بہت مختصر ہے۔ احمد بشیر نے تو خیر چار پانچ ہی خاکوں میں اس صنف کو زیر کر لیا۔ ان کے علاوہ حامد جلال کا ایک خاکہ (منٹو پر) اور عصمت چغتائی کا بھی ایک ہی خاکہ (عظیم بیگ چغتائی پر) خاکہ نگاری کی روایت کے ناقابل فراموش واقعات کی حیثیت رکھتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اپنے بیشتر خاکوں میں مزاح کے بجائے اصل کام بہت سنبھلی ہوئی شگفتہ طبعی سے لیا ہے۔ مزاح کے جا و بیجا استعمال کا بوجھ مزاح نگار تو برداشت کر سکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ موضوع بننے والی شخصیت بھی اس بوجھ کو سہار جائے۔ غور کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ مزاح نگاروں کے لکھے ہوئے خاکے بالعموم (Graffiti) بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس طرح مزاح کا موضوع بننے والی شخصیت کے بے ڈول اور بے جوڑ عناصر تو سامنے آجاتے ہیں مگر شخصیت غائب ہو جاتی ہے۔ ایسا شاید اس لئے ہے کہ مزاح لکھنے والوں میں اکثر اصحاب ضرورت سے زیادہ خود نگر ہوتے ہیں اور اپنے فرض منصبی کی طرف پل بھر کے لئے بھی بے دھیان نہیں ہونے پاتے۔ مجتبیٰ حسین کے خاکوں کی یہ خوبی بھی بہت اہم ہے کہ ان میں ہر چند کہ 'دوسرے کے بیان سے ان کے اپنے بیان' کا پہلو بھی نکلتا ہے لیکن دوسروں کی ذات کو سمجھنے کے لئے وہ نہ تو اپنی ذات کو پیمانہ بناتے ہیں اور نہ ہی اپنے کار منصبی (مزاح نگاری) سے اس درجے مغلوب ہوتے ہیں کہ ان کی بنائی ہوئی قلمی تصویر، تصویر کی پیروڈی بن جائے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ مجتبیٰ حسین اپنے خاکوں میں حسب ضرورت مزاح اور سنجیدگی، دونوں سے کام لیتے ہیں اور وہ بھی اس مشاقی اور سہولت کے ساتھ کہ دونوں میں کہیں ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اس کتاب 'آدمی نامہ' میں کم سے کم ایک خاکہ (ابراہیم جلیس کا) ایسا ہے جو تمام و کمال جذبے کی متانت اور گہرائی، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ احساسات پر ایسے زبردست کنٹرول کا پتہ دیتا ہے جس کی توقع کم سے کم کسی عام مزاح نگار سے نہیں کی جا سکتی۔ مزاح نگار اگر رسمیت کا مارا ہوا اور پیشہ ورانہ عادتوں کا شکار نہیں، تو اس کی طبیعت کے گداز اور اس کے ملال کی سچائی کا مقابلہ اچھے بھلے سنجیدہ لوگ ذرا مشکل ہی سے کر سکیں گے۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے کئی خاکوں کی وساطت سے ہمیں بالواسطہ طور پر اس حقیقت کی راہ بھی دکھائی ہے۔

❑❑❑

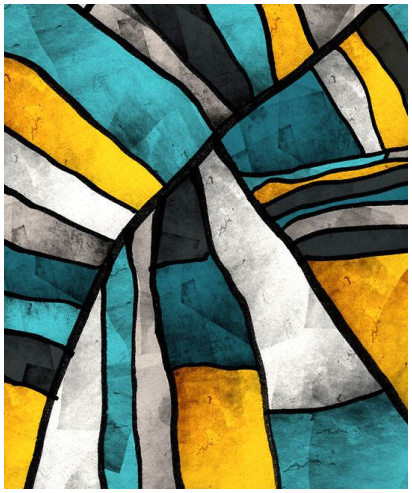

جاپان چلو... میری نظر میں

مولانا علی ناصر سعید عبقاتی

ملقب بہ آغا روحی

ناصریہ لائبریری

شاستری نگر، لکھنؤ

رابطہ: 0522-2265493

میں نے بچپن میں عربی نصابی کتابوں میں سے کسی میں پڑھا تھا کہ ضحک خاصۂ انسانی ہے یعنی ہنسی وہ خصوصیت ہے جو انسان کو دوسری مخلوقات سے الگ کرتی ہے۔ میں ذاتی طور پر اس 'خاصۂ انسانی' سے بڑی محبت کرتا ہوں۔ خصوصاً جب اندر سے ٹوٹنے کا کوئی لمحہ آ جائے تو پھر میرے ہنسنے کے عمل کا خلوص بڑھ جاتا ہے۔ شاید اسی لئے میں ہر ہنسنے اور ہنسانے والے سے جلدی متاثر نہیں ہو پاتا کیونکہ میں نے اپنے طور پر ہنسی کا ایک معیار بنا لیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب روح کے زخموں کا تازہ لہولہان پرسج جائے اور آنکھوں کے گوشے نم ہوتے چلیں تب ہنسی آئے تو وہ معیاری ہنسی ہے۔ غیر معیاری ہنسی تو کسی عام سے بات پر سطحی جذبات کے تحت یا اخلاقاً بھی آ سکتی ہے۔

میں مجتبیٰ حسین سے اس کی مزاح نگاری کی وجہ سے متاثر نہ ہو پاتا مگر مجھے مجتبیٰ کی ہنسی بہت ہی معیاری نظر آئی۔ اس کی روح کے ہر رخ پر کوئی پرانا زخم ہے اور جب وہ زخم مندمل ہونے لگتا ہے اور پھر وہیں چوٹ پڑتی ہے تو مجتبیٰ دل کھول کر ہنستا ہے۔ مگر چونکہ میں اپنی قید میں ہوں اور مجتبیٰ آزاد ہے لہٰذا جب وہ ہنستا ہے تو اپنے پڑھنے والوں کو بھی اس ہنسی میں شریک کر لیتا ہے اور یہی اس کی زخمی روح کی عظمت ہے۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے نم ہوتی ہیں اور وہ ہنستا ہے۔ اس کا کرب اس کے اندر دل پر ٹھوکریں لگاتا ہے اور وہ ہنستا ہے۔ اس کی حساس طبیعت اسے ٹارچر کرتی ہے اور وہ ہنستا ہے۔ شاید اس نے ہنسنے کو پہلے ہنر سمجھا ہوگا مگر اب تو وہ اسے فریضہ بلکہ عبادت بنا چکا ہے۔ عبادت اس لئے کہ جب اسے ہنسنے کو کوئی نہ ملے تو وہ اپنے آپ پر ہنستا ہے جو کہ دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔

دہلی میں قیام کے دوران میں نے مجتبیٰ حسین کا نیا کارنامہ سفرنامہ 'جاپان چلو جاپان چلو' پڑھا اور پڑھتے پڑھتے خیال آیا کہ مجتبیٰ سے ملوں۔ ایک مشترک دوست ہمایوں ظفر زیدی نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کی چہرہ شناسی بھی کروادی کیونکہ ہم غائبانہ ایک دوسرے سے واقف تھے۔ میں اسے صاحب قلم اور وہ مجھے خطیب کی حیثیت سے جانتا تھا۔ ملے تو دونوں کی رائے بھی ایک دوسرے سے لئے حیرت انگیز طور پر مماثل نکلی۔ میرا خیال تھا کہ ابن انشاء کے بعد مجتبیٰ حسین نے مجھے متاثر کیا ہے۔ مجتبیٰ نے کہا کہ وہ علامہ رشید ترابی کے بعد میری خطابت سے متاثر ہوا ہے۔ ابن انشاء اور علامہ ترابی دونوں ہی پاکستانی ہیں اور انتقال کر

چکے ہیں گویا کہ ہمیں فی الوقت ایک دوسرے کے لئے کسی ہندوستانی یا زندہ شخص سے متاثر ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ لہٰذا ہم دونوں اس وقت تک ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن ہیں۔

مجتبیٰ حسین آنکھیں بند کر کے نہیں ہنستا بلکہ جتنی اس کی ہنسی بڑھتی ہے اتنی ہی زیادہ اس کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں اور ان میں مشاہدے کی قوت بڑھتی جاتی ہے مثلاً:

'ہانگ کانگ ملک کیا ہے بس ایک جزیرہ سا ہے، اسے سمٹا ہوا دل عاشق کہہ لیجئے۔ جب ہمارا طیارہ نیچے اترنے لگا تو پورا جزیرہ ہماری نظروں کے سامنے تھا، فلک بوس عمارتوں کو اپنی ہتھیلی پر سجائے ہوئے سمندر کی لہروں سے کھیلتا ہوا یہ جزیرہ اتنا خوبصورت لگا کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔'

مجتبیٰ کا ذہن عام انسان سے مختلف ہے۔ اس پر کبھی خوف طاری ہوتا ہے تو وہ ڈرنے کا موقع گزرنے کے بعد پہلی فرصت میں اپنا مذاق اڑاتا ہے اور اپنے پڑھنے والوں کے دلوں سے وسوسے بھی نکالتا جاتا ہے۔

'ہانگ کانگ کے ہوائی اڈے کے بارے میں ایک بات اور عرض کر دیں کہ یہ بالکل سمندر سے متصل ہے لہٰذا جب طیارہ ہوائی اڈے پر اترنے لگتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے طیارہ ہوائی اڈے پر نہیں اتر رہا ہے بلکہ سمندر میں گر رہا ہے۔ ہمیں بھی اس منظر سے بڑی پریشانی ہوئی تھی۔ آپ کبھی ہانگ کانگ جائیں تو ہوائی اڈے کی اس ہیئت ترکیبی سے بالکل پریشان نہ ہوں۔ اللہ نے چاہا تو آپ زمین پر ہی اتریں گے۔'

وہ ہنسی ہنسی میں دوسروں کی عظمت کردار کے اعتراف اور اپنے سماجی عیوب کی نشاندہی میں نہایت سلیقہ مند ہے۔ وہ اپنے معاشرے کو پاک صاف دیکھنے کی خواہش کا اظہار گہرے طنز کے کاری نشتر سے نہیں شرمیلی مسکراہٹ سے کرتا ہے۔

'ہم نے بیدری سامان میں اس کی گہری دلچسپی کو دیکھ کر ایک ایش ٹرے اس کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کی مگر اس نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ بہت سمجھایا کہ یہ تحفہ ہے اور ہمارے یہاں کسٹم آفیسروں کو تحفے پیش کرنے کا رواج عام ہی نہیں لازمی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ بھی لیجئے۔، وہ بولا، جیسی آپ کی انفرادیت ہے ویسی ہماری بھی انفرادیت ہے۔ خیر ہم وہاں سے سامان اٹھا کر بھاگے۔'

یہاں لسانی تعصب کی جو آگ مصلحتاً دلوں

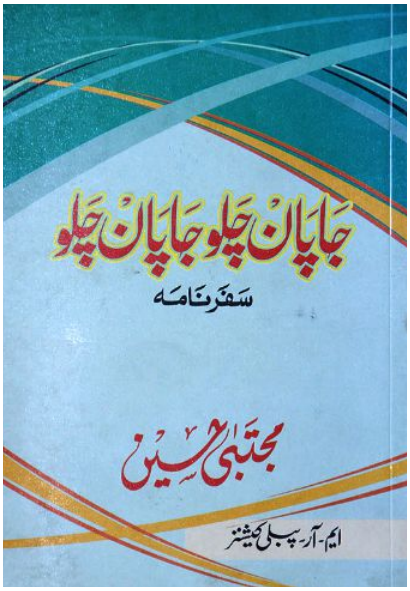

میں سلگائی گئی ہے۔ مجتبیٰ حسین کو پسند نہیں ہے۔ وہ اپنے ذہنی افق کو تنگ کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ وہ اچھے ادب کی تخلیق اور پھیلاؤ کی تائید میں ہے۔ اسے خبر ہے کہ تنگ نظری کا انجام خود پسندی کی دلدل میں زندہ دفن ہو جانے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ لسانی تعصب اور اول قلم کی چنگاری اور آخر آخر فرقہ وارانہ فسادات کی وبا بن جاتا ہے۔ اس نے لسانی تعصب کی آگ کے خلاف ہنسی کی شبنم کو حربے کے طور پر استعمال کیا ہے۔

پروفیسر تنا کا چونکہ ہندی کے پروفیسر ہیں اس لئے ہم نے ان سے پوچھا، آپ کے ہندی و بھاگ میں کتنے ودیارتھی شکشا پراپت کر رہے ہیں؟

بولے، میرے شعبے میں ساٹھ طلباء زیر تعلیم ہیں۔

ان کے منھ سے فارسی آمیز ہندی سنکر ہم بھونچکے رہ گئے۔ جاپان ریڈیو کے مسٹر اکی رااناہارا سے ہم نے پوچھا، اور مہاشے جی! آپ کے ریڈیو سے ہندی پرسارن کس سمے ہوتا ہے؟

بولے، آپ غالباً جاپان ریڈیو کی ہندی نشریات کے نظام الاوقات کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔

ہم نے کہا، جاپان ریڈیو کا نظام الاوقات تو ہم بعد میں جانتے رہیں گے پہلے یہ بتائیے کہ آپ ہندی پروگرام کے انچارج ہیں لیکن اتنی اچھی اردو کیسے بول رہے ہیں؟

مسٹر اناہارا بولے، قبلہ! یہ ہندی اور اردو کے جھگڑے تو آپ کے ملک کو مبارک ہوں۔ ہمیں ان جھگڑوں سے کیا لینا دینا۔ دونوں زبانوں کی گرامر تقریباً یکساں ہیں۔ تھوڑی سی سنسکرت اور تھوڑی سی فارسی اور عربی سیکھ کر ہم حسب موقع آپ کی اردو اور ہندی دونوں زبانوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ ہم جاپانی کاروباری آدمی (لوگ) ٹھہرے۔ ایک تیر سے دو شکار کرنے کی ہمیں عادت ہے۔ جاپان میں جو آدمی ہندی جانتا ہے، وہ اردو بھی جانتا ہے اور جو اردو جانتا ہے وہ ہندی بھی جانتا ہے۔

ہم نے دل میں سوچا کہ اے کاش ہمارے ملک میں بھی لوگ زبانوں کے معاملے میں کم از کم اتنے کاروباری ہوتے تو ہندی اور اردو کا جھگڑا ہی نہ ہوتا۔

مجتبیٰ بیحد فراخدل ہے۔ اس نے ٹوکیو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر سوزوکی کا پتہ صرف اس لئے کتاب میں شامل کیا ہے کہ اگر اردو کے صاحبان قلم اپنی مطبوعات ٹوکیو یونیورسٹی

کے کتب خانے کو بھیجنا چاہیں تو بھیج سکتے ہیں۔ اس نے کسی ناقد، شاعر یا ادیب تک محدود نہ رہ کر اردو کے تمام صاحبان قلم سے اپیل کی ہے کہ اپنی کتابیں وہاں بھیجیں کیونکہ مجتبیٰ کو یہ بات ذرا کھل سی گئی کہ وہاں پاکستانی مطبوعات وافر مقدار میں موجود ہیں مگر ہندوستانی مطبوعات افسوسناک حد تک کم ہیں۔ یہ پاکستانی صحافی اور افسانہ نگار ابراہیم جلیس کے ہندوستانی بھائی مجتبیٰ حسین کا جذبۂ حب الوطنی ہے اور فراخدل مجتبیٰ حسین کی وسیع القلبی ہے کہ وہ خود بھی جس سے واقف یا متعارف نہیں ہے انہیں جاپان میں متعارف کروانا چاہتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کی شخصیت کا یہ پہلو انسانیت اور اردو کے تاجروں کے لئے ایک سبق ہے اور ساتھ ہی ساتھ انسانیت اور اردو کے لئے قابل فخر۔

یونیسکو کے میزبانوں نے مندوبین کی شاندار میزبانی کی جس کا سب سے ہلکا جز وہ چھتریاں تھیں جو مندوبین میں وقتی طور پر تقسیم کی گئی تھیں اور انہیں روانگی سے پہلے واپس کرنا تھا۔ مجتبیٰ نے اپنی چھتری کو ٹوکیو میں واقع اپنے ہوٹل سے دہلی میں واقع اپنے گھر تک ایک بہت بڑے بادل کی پھیلا دیا جس کے نیچے وہ خوب اچھی طرح بھیگتا رہا۔ ہنستا رہا اور ہنساتا رہا مگر جب ٹوکیو سے چلتے چلتے وہ چھتری اسے واپس کرنا پڑی تو اس کی ہنسی اچانک بہت ہی زیادہ معیاری ہوگئی یعنی اس کی پلکوں پر آنسو اور ہونٹوں پر ہنسی کی شدت نے اس کے قارئین کے دلوں کو بھی بوجھل کر دیا۔ جسے ۴۵ دن کے ساتھ کی وجہ سے ایک بے جان چھتری سے اتنا جذباتی لگاؤ ہو جائے وہ دوستوں کے سلسلہ میں کتنا حساس ہوگا۔ کیا ضروری ہے کہ جب مجتبیٰ دوبارہ یونیسکو کی کانفرنس میں جائے تو اسے وہی چھتری ملے جو گزشتہ سفر میں ملی تھی مگر گداز فطرت مجتبیٰ تو ہر بچھڑنے والے سے دوبارہ ملنے کی امید کے سہارے جینا چاہتا ہے۔ وہ از حد جذباتی اور حساس ہے لیکن اس نے اپنی ذات کے گرد ہنسی کا جادوئی حصار کھینچ رکھا ہے۔ اس حصار کے باہر صرف اس کی ہنسی کی آواز سنائی دیتی ہے، رونے کی نہیں۔ مجتبیٰ کے رونے کی آواز صرف وہی سن سکتا ہے جو اس جادوئی حصار کے اندر پہنچ سکے جو اس کی زخمی روح کو پڑھ سکے جو اس کی کشادہ آنکھوں سے سمجھ سکے۔

'جاپان چلو جاپان چلو' پڑھنے کے بعد مجھے اپنے بارے میں یہ خوش فہمی سی ہو گئی ہے کہ میں نے مجتبیٰ حسین کو پڑھ لیا۔ وہ مجتبیٰ حسین جو کئی تہوں کے اندر بہت اندر چھپا ہوا ہے، چپکے چپکے سسکیاں لے رہا ہے اور اپنے باہر ہنس رہا ہے، ہنسا رہا ہے۔

اس سفرنامے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مجتبیٰ نے شریف مہمان کی حیثیت سے جاپان کی کوئی برائی نہیں کی اور یہ بھی اس کی بڑائی ہے۔

مجتبیٰ حسین تم اپنی بڑی اور چھوٹی، گہری اور سطحی حیثیتوں سمیت مجھے مل گئے لہٰذا 'دوموآری گا توگزائی مس' تمہارا بہت بہت شکریہ۔

□□□

مجتبائی مزاح، کا تو میں قتیل ہوں۔ ان کی تحریروں سے میں نے وہ کچھ سیکھا ہے، جو میری عمر کے لوگوں کو قطعی نہیں سیکھنا چاہئے۔ ان کے لفظوں کی 'خوش اعضائی' دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ عمر وہیں بسر کیجئے۔ مجتبیٰ حسین کی تحریروں کا چسکا علی گڑھ میں پڑ چکا تھا، کیا خبر تھی کہ دلی میں فیض حضوری سے بہرہ یاب اور متمتع ہونے کا موقع ملے گا۔ علی گڑھ کے ہی زمانے میں ان کی ایک کتاب 'تکلف برطرف' کا بڑا شہرہ تھا، وہ بھی پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ میرے کراماً کاتبین کو بھی پتہ نہیں تھا کہ آگے چل کر یہی میرے کالم اور کتاب کا عنوان بھی ٹھہرے گا۔ مجتبیٰ حسین کے لفظ میں نے نہیں بہتوں نے چرائے ہوں گے مگر ان کی کتاب کے عنوان پر بھی 'شب خون' ماروں گا، یہ توقع کم از کم لوگوں کو مجھ سے نہ تھی کہ میں اس معاملے میں خاصہ بے جرأت واقع ہوا ہوں۔ اپنی اس بے جرأتی پر کبھی کبھی شرمگیں بھی ہوتا ہوں مگر اپنی اس تازہ جرأت پر خدشہ ہے کہ مہر نیم روز کے سراغ رسانوں حسن مثنیٰ ندوی، علی اکبر قاصد، ابوالخیر کشفی، فرمان فتح پوری کو اس کی بھنک مل گئی تو 'چہ دلاور است' مشرق و مشرق کی سرقہ بازی کی تاریخ میں میرا بھی نام جڑ جائے گا۔ میں کوئی ابوطالب کلیم تو ہوں نہیں کہ یہ کہوں:

به خوان فیض الهی چو دست رس دارم
نظر به کاسۂ یوزۂ گدا نه کنم

میں بہ بانگ دہل یہ اعتراف کرتا ہوں کہ 'تکلف برطرف' مجتبیٰ حسین کی مقبول ترین کتاب کا نام ہے اور میری کتاب کا عنوان بھی اسی سے ماخوذ اور مستفاد ہے مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں، یہ گناہ ان لوگوں کے سر ہے جنہوں نے کالم کا یہ عنوان تجویز کیا۔ میری خطا بس اتنی ہے کہ میں اس عنوان پر راضی برضا ہوگیا اور یوں بھی اب ہمارے عہد میں ایسی قباحت نہیں رہی کہ بین المتونیت پر نئے متون کی تشکیل کا عمل دھڑلے سے جاری ہے، اسے تخلیق بازآفرینی کا نام دے کر سرقہ کے اتہام سے بآسانی بچا جا سکتا ہے اور یوں بھی ایک فارسی شعر میں توارد کا دفاع موجود ہے۔

مبر گمان توارد یقین شناس که دزد
متاع من زنهان خانۂ ازل برداشت

(توارد کا گمان نہ کرو بلکہ یقین جانو کہ خزانۂ ازل سے چور میرا مال چرالے گیا۔)

بہر حال معاملہ توارد یا نقل وتقلید کا ہو، لوگ کچھ بھی کہیں، مجھے تو اتنا منافع ضرور ہوگا کہ مجتبیٰ حسین کے مغالطے میں شاید کچھ لوگ اس 'تکلف برطرف' کو بھی پڑھنے کی غلطی کریں جو مجتبیٰ حسین کے تکلف برطرف کی گرد کے برابر بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے بس میری یہی دعا ہے کہ مغالطہ برقرار رہے اور تا سطر آخر برقرار رہے۔

(حقانی القاسمی)

مجتبیٰ حسین کی بے مثال فنکاری

فیاض رفعت

328، ایلڈکو گرین ولا
گومتی نگر، لکھنؤ

رابطہ: 9936138470

زندگی ایک معمہ ہے، سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ ابتدا کی خبر نہ انتہا معلوم۔ ہم زندگی کے پچھتر بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ نومبر میں چھہتر کے ہو جائیں گے۔ بہاریں تو ہم نے محاورتاً لکھ دیا ہے ورنہ دنیا تو ایک آشوب خانہ ہے جو پل پل آپ کا امتحان لیتی ہے۔ طرح طرح کی آزمائشوں سے گزارتی ہے۔ ہم نے بھی ستم جھیلے ہیں۔ اگر سخن جان نہ ہوتے تو اب تک خاتمہ بالخیر ہو چکا ہوتا۔ مجتبیٰ ہم سے چار سال بڑے ہیں۔ نسبتاً انہوں نے ہم سے چار ستم زیادہ جھیلے ہوں گے۔ زندگی کی ناہمواریوں سے برسر پیکار رہنے کا یہ ہنر انہوں نے اپنے طنز و مزاح کی تلخی اور شیریں بیانی میں تلاش کیا۔ ہم نے انہیں جب بھی دیکھا تبسم بہ لب دیکھا۔ وہ کہیں بھی ہوں، کیسی محفل میں ہوں، اپنی شگفتہ گوئی سے سنجیدہ ترین لوگوں کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان کا طنزیہ مکالمہ آرائی میں بھی شیریں بیانی کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

ایک بڑے ادیب نے مضمون لکھا تھا 'مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ' اگر ہم سے کوئی مدیر فہمائش کرتا تو ہم لکھتے 'مجھے ہمارے دوستوں نے بچا لیا' یہ ہماری خوش بختی ہے کہ خدا نے ہمیں غیر مشروط محبت کرنے والے ایسے دوستوں، مونسوں اور غم خواروں سے سرفراز کیا ہے جنہوں نے ہماری کٹ حجتی، کج بحثی اور یاوہ گوئی کے باوجود نہ صرف سینے سے لگایا بلکہ ہماری تراش خراش کر کے ہمیں کہیں کہیں سے انسان بننے کا حوصلہ بھی بخشا۔

آج ہم اپنے ایک ایسے ہی سچے رفیق اور حبیب مجتبیٰ حسین کا تخلیقی محاسبہ کر کے خود کو مفتخر کرنا چاہتے ہیں جو گزشتہ چالیس پینتالیس برسوں سے ہم جیسے ناتراشیدہ اور منھ پھٹ شخص کو جھیل رہے ہیں۔ بالمشافہ ملاقات ہو نہ ہو، ٹیلی فون پر ہم سے برابر رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ ہماری بے سروپا، بے لگام اور واہیات گفتگو کو وہ طنز و مزاح کے زمرے میں شامل کر یک خوب خوب محظوظ ہوتے ہیں، حالانکہ وہ بذات خود طنز و مزاح کی دنیا کے ایسے البیلے کولمبس ہیں جنہوں نے یگانہ افسانوی اسلوب کی طرح ڈالی ہے۔ جو الف لیلوی داستانوں کی طرح سحر خیز ہے۔ صریر خامہ سے جو جادو انہوں نے جگایا ہے اور لفظوں کو جس طرح مصور کیا ہے، اس کا جواب وہ خود ہیں، کوئی اور نہیں۔ ان کے قلم کی شگفتگی اور شیفتگی کی ایک دنیا قائل ہے۔ کاغذ پر لکھی ان کی تحریر کو ان کا نام پڑھے بغیر ہم سمجھ جاتے ہیں کہ اس پردۂ زنگاری کے پیچھے کون ہے۔

مجتبیٰ حسین کی صحرانوردی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ عاشق کا دل لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ وہ سرتاپا عشق ہیں اور انہیں اس بوقلمونئ کائنات کے ذرے ذرے سے پیار ہے۔ برطانیہ، جاپان، فرانس، امریکہ، کنیڈا، روس، ازبیکستان، پاکستان، سعودی عرب، سلطنت عمان اور متحدہ عرب امارات کی سیاحی کر چکے ہیں۔ اس لئے اگر انہیں 'حیدرآبادی ابن بطوطہ' کے لقب سے موسوم کیا جائے تو بجا طور پر برحق ہوگا۔

ہم نے ان کے جاپان، برطانیہ، امریکہ اور فرانس کے سفرنامے پڑھے تو ان سبھی ممالک کی تہذیب وثقافت کے ساتوں رنگ ہمارے ذہن کے افق پر روشن ہوتے چلے گئے۔ وہاں کے لوگوں کی بودو باش، وہاں کے اشتہا انگیز کھانے، وہاں کے راگ رنگ، وہاں کی موسیقی، نغمہ ونور بن کر ہمارے حواس پر چھا گئے۔ وہاں کے موسموں کی دلنواز انگڑائیاں کبھی بارش بن کر ہمارے وجود کو شرابور کر گئیں اور کبھی برف باری کے سفید روئی جیسے براق گالوں نے ہمیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ لفظوں کی رنگولی سے فطرت کے مناظر کو زندہ اور تابندہ بنا کر پیش کرنے کا فن کوئی مجتبیٰ سے سیکھے۔

مجتبیٰ حسین کو جاپان نے اور جاپان کو مجتبیٰ حسین نے جس طرح مشکور ومسحور کیا ہے اس کے لئے حسب دلخواہ داد دینے کے لئے لفظوں کا خزینہ کم پڑتا نظر آتا ہے۔ برسبیل تذکرہ ہم عرض کرتے چلیں کہ اردو میں پہلا سفرنامہ یوسف خاں کمبل پوش نے لکھا تھا جو حیدرآبادی تھے۔ مجتبیٰ حسین کا دل تو ایک ہی ہے مگر یہ ایک ایسے عاشق کا دل ہے جس کی گدازیت تیسری آنکھ بن کر نوآبادیاتی اور سرمایہ دارانہ نظام کو ہدف ملامت بنا کر وہ خود بھی حظ اٹھاتے ہیں اور اپنے قارئین کو بھی شادوفرحاں کرتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین مجلسی آدمی ٹھہرے اور ان معنوں میں بھی ہشیار بہت نکلے کہ انہوں نے دنیا کی سیر کرنے میں ذرا بھی غفلت سے کام نہیں لیا۔ ہندوستان میں ملنے جلنے والوں کا اتنا وسیع حلقہ ہم نے کسی اور کا نہیں دیکھا۔ اندر کمار گجرال، مقبول فدا حسین، علی محمد خسرو، ہاشم علی اختر، مخدوم محی الدین، سید حامد، پروفیسر خورشید الاسلام، باقر مہدی، گوپی چند نارنگ، یوسف ناظم، شاذ تمکنت، رشید حسن خاں سے لے کر کشور ناہید، شہریار، ہرشنکر پرسائی، شکیلہ بانو بھوپالی، محمد علوی، مخمور سعیدی، امیر قزلباش، راشد آزر، قاضی سلیم، دلیپ سنگھ اور بھی بے شمار لوگوں کا مجتبیٰ حسین نے خاکہ اڑایا ہے۔ طنز و مزاح کے ممتاز شاعر دلاور فگار پر ان کی تحریر نہ صرف دلاور فگار بلکہ انہیں بھی زندہ رکھے گی۔

مجتبیٰ کی غیر معمولی یادداشت پر ہر شریف آدمی کو رشک ہونا چاہئے۔ جزئیات نگاری میں انہیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ ان کی افسانوی طرزِ تحریر میں 'ڈبل کا میٹھا' کی چاشنی ہوتی ہے۔ اتفاق سے انہوں نے اپنی پیدائش کا حال احوال نہیں لکھا ورنہ وہ یہ ضرور لکھتے کہ دنیا میں ان کی ولادت روتے ہوئے نہیں بلکہ ہنستے ہوئے ہوئی تھی۔ ان کی ہزار خوبیوں میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر بات میں مزاح کا پہلو نکال لیتے ہیں یا یوں کہئے کہ مزاح ان پر نازل ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ مزاح کے افضل ترین پیامبر اور پیغمبر ہیں تو کچھ زیادہ غلط نہ ہوگا۔ انہوں نے پوری زندگی ہنستے ہنساتے ہوئے گزاری ہے۔ یہ مشکل فن انہوں نے اپنے بڑے بھائی ابراہیم جلیس سے سیکھا ہے جو فکاہیہ کالم سے لے کر افسانہ فسوں اور ناول کی بزم آراستہ کرنے میں لاثانی تھے۔ ان کے ناول کے کردار خواتین میں اس قدر مقبول تھے کہ وہ ان کا آموختہ کر لیتی تھیں اور خود پر طاری کر کے ایک دوسرے کو سناتی تھیں۔

ابھی ہم رات میں مجتبیٰ حسین کے سفرنامے پڑھ رہے تھے۔ جب سے ہم 'انسومنیا' کے مریض ہوئے ہیں، ہم مجتبیٰ کی کوئی نہ کوئی کتاب تکیہ کے نیچے رکھتے ہیں اور کہیں سے بھی کھول کر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور اس وقت تک پڑھتے رہتے ہیں جب تک نیند کا ساون ہماری آنکھوں میں جھولنے نہ لگے مگر نیند ہے کہ نہیں آتی اور جب نہیں آتی تو ہم پھر مجتبیٰ حسین کا ورد کرنے لگتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے سفرنامے حسن چشتی نے مرتب کئے اور جاپان کے سفرنامے کو اوّلیت دی ہے جہاں ٹوکیو میں یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کی طرف سے منعقد ہونے والے پبلشنگ کورس میں حصہ لینے کے لئے مرکزی وزارت تعلیم نے ہندوستان کی نمائندگی کے لئے مجتبیٰ کا انتخاب کیا تھا۔ جاپان کے علاوہ انہیں یورپ، سابق سویت یونین، مسقط، سعودی عرب، دبئی اور امریکہ کی مٹرگشتی کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہ فرانس بھی ہو آئے جہاں ان کے ایک نادیدہ حیدرآبادی دوست نے ان کی میزبانی کا شرف حاصل کر کے خود کو مشکور کیا۔ حیدرآبادیوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ دنیا بھر کے ملکوں میں انہوں نے ایک منی حیدرآباد آباد کر رکھا ہے اور وہاں کی تہذیب وثقافت کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ حیدرآبادی بریانی، بگھارے بیگن، قیمے کے پراٹھے، حلیم اور ڈبل کے میٹھے سے وہ اپنی محفلوں کو شیرینی سے بھر دیتے ہیں۔ میزبانی اور قدردانی کوئی ان سے سیکھے۔

مجتبیٰ نے اپنے جاپانی سفرنامے میں شگفتہ طرازی اور معنی آفرینی کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ قلم کے بجائے ان کا منھ چوم لینے کو دل کرتا ہے۔ دلی سے ان کا جہاز جب کلکتہ سے گزر رہا تھا اور بنگال کی کھاڑی میں داخل ہوا چاہتا تھا تو پائلٹ نے اطلاع دی کہ اس کے بعد بنکاک تک کا سفر سمندر کے اوپر سے طے ہوگا۔ اب مجتبیٰ کے قلم کی رنگ آمیزی ملاحظہ ہو:

'سمندر چاندی کی چادر کی طرح نیچے بچھا ہوا تھا اور کہیں کہیں کوئی جزیرہ اس چادر میں پیوند کی مانند نظر آجاتا تھا۔ تھائی لینڈ کی سرزمین کو ہم

۴۵ ہزار فٹ کی بلندی سے دیکھتے رہے۔ ناریل کے درختوں اور جگہ جگہ بہتی ہوئی ندیوں اور نہروں کے جال نے آنکھوں میں سرور اور دل میں وہ گداز پیدا کیا کہ جی چاہا آج کی صبح کی شام کبھی نہ ہو۔ یہ صبح یوں ہی ساری کائنات پر آکری سانس تک پھیلی رہے۔ ہم میں ایک بری عادت یہ ہے کہ شاعروں کو ناپسند کرنے کے باوجود کبھی کبھی ہم خود بے ارادہ طور پر شاعر بننے لگ جاتے ہیں۔'

بنکاک سے اڑ کر جہاز ہانگ کانگ پر اترنے لگا تو مجتبیٰ نے بے پناہ معلومات کا خزانہ لٹاتے ہوئے اپنی رمیدہ تحریروں میں کلیوں کی خوشبو اس طرح جگائی کہ حرف حرف گلوں میں تبدیل ہوگیا۔ ملاحظہ ہو:

'ہانگ کانگ ملک کیا ہے بس ایک جزیرہ سا ہے۔ اسے سمٹا ہوا دل عاشق کہہ لیجئے۔ پورا جزیرہ ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ فلک بوس عمارتوں کو اپنی ہتھیلی میں سجائے ہوئے سمندر کی لہروں سے کھیلتا ہوا یہ جزیرہ اتنا خوبصورت لگا کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ یہاں برسوں انگریزوں کی حکمرانی رہی ہے اور اب بھی ایک اعتبار سے ہے۔ باشندے زیادہ چینی ہیں۔ چینی زبان بولتے ہیں اور انگریزی پر بھی ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ یہاں سے چین کی سرحد بھی دکھائی دیتی ہے۔ بڑا کاروباری مرکز ہے۔ ہانگ کانگ کی رونق وہاں کے باشندوں سے نہیں بلکہ ان سیاحوں سے ہے جو یہاں آتے ہوئے اپنی جیبوں میں دولت اور دلوں میں ارمان بھر کر آتے ہیں۔ چونکہ ہانگ کانگ کی بندرگاہ ایک فری پورٹ ہے اس لئے ہر کوئی منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔ یہاں ہر چیز بکتی ہے۔ ہمارے ایک دوست اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ دو سال پہلے ہانگ کانگ کے ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں سامان خریدنے گئے، چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھیں، کوئی شئے پسند نہ آئی۔ اچانک سیلز گرل پر جو نظر پڑی تو وہ پسند آگئی لہٰذا سیلز گرلز کو خرید کر لے آئے۔'

غرض کہ مزید ساڑھے تین گھنٹے کا سفر طے کر کے مجتبیٰ ٹوکیو پہنچ چکے تھے۔ ان کے استقبال کے لئے مس کمورا اور ایشیائی ثقافتی مرکز کے بک ڈیولپمنٹ ڈویژن کی سربراہ مسز آسانو موجود تھیں جو بقول ابن انشاء ہر مشکل کو آسان کر دیتی تھیں۔

مجتبیٰ کو ٹوکیو کے شاندار گرین ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ ان کی رہنما خاتون مسز آسانو نے نہایت خوشدلی کے ساتھ پہلے انہیں ایک چائنیز ریستوراں میں ڈنر کرایا اور پھر تمام تر محبتوں کے ساتھ ہوٹل کے روم تک ان کی رہنمائی کی اور ان پر یہ انکشاف بھی کیا کہ پاکستان کے مشہور مزاح نگار ابن انشاء بھی اسی ہوٹل میں بارہا قیام کر چکے ہیں نیز یہ کہ ان کی میزبانی کے بارہا فرائض انجام دے کر مفتخر ہو چکی ہیں۔ اب جب کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں، بس ان کی یادیں رہ گئی ہیں۔ مسز آسانو یہ کہتے کہتے جذباتی ہوگئیں مگر جلد ہی انہوں نے خود پر قابو پا لیا۔ ماضی سے حال میں لوٹتے ہوئے انہوں نے مجتبیٰ پر انکشاف کیا کہ ہوٹل کے برابر شہنشاہ جاپان کا محل ہے۔ یوں مجتبیٰ کو پہلی بار شاہی پڑوس حاصل ہوا تھا ورنہ حیدرآباد میں تو وہ اپنے پڑوسیوں سے منہ چھپائے پھرتے تھے کہ وہ ان کو دیکھتے ہی قرض مانگنے کی طرح طرح کی جھوٹی تاویلیں پیش کرنے لگتے تھے بلکہ بعض قرضداروں نے تو ان کو اتنا زیر بار کیا کہ وہ ہر چھ مہینے کے بعد مکان تبدیل کرنے لگے۔ شب بخیر کہہ کر مسز آسانو مجتبیٰ سے جدا ہوئیں تو انہوں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں ٹیلی فون اور ٹیلی ویژن کی سہولت موجود تھی۔ قالین سے بھی مرصع تھا مگر حدود اربعہ کے اعتبار سے کمرہ اتنا مختصر تھا کہ پانچ فٹ گیارہ انچ کے مجتبیٰ حسین پلنگ پر نیم دراز ہوئے تو ٹیلی فون کا چونگا ان کے سر پر بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ اس بار ٹی وی کے انٹینا نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔

مجتبیٰ حسین لکھنے کے علاوہ ہر کام میں تاخیر سے کام لیتے ہیں۔ سوتے بھی تاخیر سے ہیں اور یوں بھی راتوں کو دوستوں کے ساتھ گپیں لڑانا اور سڑکوں کی پیمائش کرنا ان کا پرانا شغل رہا ہے۔ ابھی رات کے آٹھ بجے تھے۔ وہ کمرے سے باہر نکل آئے اور کاریڈور میں مستی کرنے لگے۔ اچانک ان کی نظریں تھائی لینڈ کے ایک حسین مندوب سے دوچار ہوئیں جو غالباً اسی دن ہوٹل میں وارد ہوئی تھی۔ پکے رنگ کے باوجود مجتبیٰ کے چہرے کے نقش ونگار ایسے تیکھے اور دلنواز ہیں کہ بے اختیار ان پر پیار آتا ہے۔

کشش ثقل سے مجبور ہو کر تھائی لینڈ کی مندوب نے ان سے استفسار کیا۔ آخر وہ اس طرح کاریڈور میں کب تک ٹہلتے رہیں گے۔ مجتبیٰ اس 'عندیہ طلبی' پر یوں مسکرائے کہ جان سی کلیوں میں پڑ گئی۔ پھر انہوں نے گل افشانی گفتار کا جادو جگاتے ہوئے انکشاف کیا کہ انہیں نیند دیر سے آتی ہے اور وہ ٹوکیو کی شفاف سڑکوں کے جائزے کے لئے نکلنے والے ہیں جو اپنی دلکشی کے لئے ساری دنیا میں مشہور ہیں اور جو رات بھر روشنی کے سمندر میں غلطاں اور پیچاں رہتی ہیں۔ اس طرح گھنٹے دو گھنٹے کی سیر بھی ہو جائے گی اور نیم باز آنکھیں مست و بیخود ہو کر نیند کی آغوش میں بھی چلی جائیں گی۔

حسن کی دیوی نے التماس کیا کہ اگر انہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ بھی نور و نکہت میں ڈوبی ہوئی ٹھنڈی شاہراہوں پر ان کے ساتھ چہل قدمی کرنا چاہے گی۔ غرض کہ نیکی اور پوچھ پوچھ کے مصداق مجتبیٰ کی چاندی ہوگئی اور کسی اندیشہ ہائے سود و زیاں کا خیال کئے بغیر حسینہ ان کے ساتھ اور وہ حسینہ کے ساتھ ٹوکیو کی کھلی نم آلود نقرئی شاہراہوں پر بھٹکنے کے لئے نکل پڑے۔ دو گھنٹے کے سیر سپاٹے کے بعد ہوٹل واپس آئے تو مجتبیٰ بیحد مسرور و مشکور تھے بلکہ مسحور بھی تھے اور ان پر

رومان کی نشہ انگیز کیفیت طاری ہوگئی تھی۔مجتبیٰ نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی رات کی ہم سفر تھائی لڑکی پرینیا سویٹ ڈریمز کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی مگر از راہِ لطف انہوں نے یہ نہیں بتلایا کہ کس کے کمرے میں اس نے اپنے وجود کی خوشبو بکھیر دی؟ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ یہ پہلے دن کی ملاقات مستقل دوستی میں بدل گئی۔

ان کے سفرناموں کا طلسم انگیز بیانیہ ہمارے قلب ونظر کو اس طرح برماتا ہے کہ ہم دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوکر اس جہاز تازہ کی الف لیلوی فضاء میں کھوکر رہ جاتے ہیں جسے مجتبیٰ اس طرح خلق کرتے ہیں جیسے کرامات کررہے ہوں۔

جاپان کا سفرنامہ پڑھ کر ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے ہم ان کی پرچھائیں بن کر خود بھی سیر بینی میں شامل ہوگئے۔مجتبیٰ جب ٹوکیو کے پروفیسر سوزوکی (Suzuki) کا ذکر مسعود کرتے ہیں تو ان کے قلم کی توانائی، اظہار کی برنائی اور تازہ کاری دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔ ان کی پُر از معلومات یادداشت کسی کو بھی رشک میں مبتلا کرسکتی ہے۔جاپان میں سوزوکی نام کا استعمال اتنا عام ہے کہ جس ٹیکسی میں مجتبیٰ سفر کررہے تھے، اس کے ڈرائیور کا نام بھی سوزوکی تھا اور وہ گاڑی چلا رہا تھا وہ بھی سوزوکی کہلاتی تھی اور جن پروفیسر موصوف نے انہیں ٹوکیو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی تہنیتی تقریب میں مدعو کیا تھا وہ بھی سوزوکی تھے۔

ٹوکیو یونیورسٹی کے غیر ملکی زبانوں کے شعبہ میں فارسی اور عربی کے علاوہ ہندی اور اردو پڑھانے کا بھی نظم ہے۔اسی طرح اوساکا یونیورسٹی میں بھی اردو کے طالب علم نہ صرف بی اے کررہے ہیں بلکہ کرشن چندر اور عصمت چغتائی پر پی ایچ ڈی تھیسس بھی لکھ رہے ہیں۔طلبہ میں جاپانی گڑیا جیسی طالبات کی تعداد کہیں زیادہ ہے جن پر مجتبیٰ حسین کی شخصیت سحر کچھ اس قدر طاری ہوا کہ ایک طالبہ نے ان کے جاپانی سفرنامے کو جاپانی زبان میں منتقل کردیا۔

جاپان میں مجتبیٰ کی پذیرائی میں اتنے عصرانے، ظہرانے اور عشائیے دئے گئے کہ ان کا پیٹ بھاری ہو گیا۔جاپانی نہایت فراخدل واقع ہوئے ہیں۔وہ اپنے مہمانوں کو ڈھیروں تحفے سے نوازتے ہیں۔مجتبیٰ کے ہوٹل کا کمرہ تحفوں تحائف سے بھر گیا تھا۔دشواری یہ آن پڑی تھی کہ ہوائی جہاز میں بیس کلو سے زیادہ وزن لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔انہوں نے اپنی پریشانی کا ذکر اپنے ایک میزبان سے کیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ تحفے بحری جہاز کے ذریعہ بھجوائے جاسکتے ہیں۔

مجتبیٰ نے ان کے صائب مشورے پر عمل کرتے ہوئے تحفوں کا اضافی سامان بحری جہاز میں بک کرادیا۔ابھی مجتبیٰ کو ٹوکیو میں ایک ہفتہ اور گزارنا تھا۔ان سات دنوں میں ان کا کمرہ دوبارہ تحفوں سے بھر گیا۔ بہ امر مجبوری انہیں دوبارہ بحری جہاز کی خدمت حاصل کرنی پڑیں۔تحفوں کی زیادتی سے تنگ آکر اب وہ جس تقریب میں جاتے تھے، تحفے وہیں چھوڑ آتے تھے مگر ہوٹل میں آنے پر انہیں پتہ چلتا تھا کہ تحفے خود چل کر ان کی آمد سے پہلے ان کے کیوبک (Cubic) کمرے میں پہنچ جاتے چکے ہیں۔

مجتبیٰ جب ٹوکیو گئے تو انہیں ایک چھتری دی گئی اور تاکید کی گئی کہ وہ اس چھتری کا ہر طرح خیال رکھیں کیونکہ یہ یونیسکو کی امانت ہے۔چھتری اس لئے دی گئی کہ جاپان میں بلا کسی پیشگی اطلاع کے بارش شروع ہوجاتی ہے۔ٹوکیو کے پینتیس دنوں کے قیام میں وہ بار بار چھتری بھول جاتے تھے۔ غرض کہ چھتری کی بازیابی کے لئے انہیں ٹیکسیوں، بسوں اور ٹرینوں میں بارہا سفر کرنا پڑا۔انہوں نے حساب لگایا تھا ان اسفار میں ان کے پانچ ہزار ریان خرچ ہوچکے تھے۔مزید لطیفہ یہ ہوا کہ ان کے ۳۵ دنوں کے قیام میں محض ایک بار بوندا باندی ہوئی اور انہوں نے جب چھتری کو کھولنا چاہا تو ایک جاپانی کی مدد لی۔چھتری کھل گئی مگر بارش رک چکی تھی۔ایک اور جاپانی راہگیر سے درخواست کرکے انہوں نے چھتری کو بند کرایا۔جاپانی ان کی آمد سے یوں بھی خوش تھے کہ جب تک مجتبیٰ ٹوکیو میں رہے موسم خوشگوار رہا۔

جب دن مجتبیٰ کو یونیسکو کی چھتری دی گئی تو انہوں نے اس کی اطلاع دیتے ہوئے بیوی کو خط لکھا۔ملاحظہ ہو:

'وہ ہمیں آج ملی ہے، دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے۔اب ہمیں اسی کی رفاقت میں ٹوکیو کے شب و روز گزارنے ہیں اور اسی کے سائے میں رہنا ہے۔'

آٹھ دن بعد ہم اپنے ہوٹل کے کمرے میں گہری نیند سے لطف اندوز ہورہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔نیند سے جاگ کر فون کا ریسور اٹھایا تو پتہ چلا کہ

> سماج کے مجبور اور محکوم انسانوں کے دکھوں اور محرومیوں کا شدید احساس مجتبیٰ حسین کے فن ظرافت کا وہ پہلو ہے جو اردو مزاح نگاری میں ان کی علیٰحدہ شناخت کو مستحکم کرتا ہے۔دردمندی کا یہی وہ عنصر ہے جس کے بغیر زندہ رہنے والا آرٹ جنم نہیں لیتا۔ فنکار دکھی انسانوں سے رشتۂ یگانگت جوڑ کر ہی وسیع تر انسانیت کی آواز بنتا ہے۔اس طرح وہ ان قوتوں کے خلاف احتجاج بھی کرتا ہے جو انسان کو غم کے اندھیروں میں ڈھکیلتی آتی ہیں۔عرفان غم کا یہ منصب دوسرے فنکاروں کے مقابلے میں مزاح نگار کے لئے زیادہ آزمائشوں کا حامل ہوتا ہے۔ یہی وہ منصب ہے جس نے چارلی چیپلن کے سر پر بے مثال عظمت اور عالمی شہرت کا تاج سجا دیا تھا۔مجتبیٰ حسین نے اپنے مزاحیوں میں ایسے ہنر اور حربوں سے کام لیا ہے کہ طنز کے باوجود خوش طبعی اور شگفتگی کی ایک ہموار کیفیت ابتدا سے آخر تک قائم رہتی ہے۔
>
> (ڈاکٹر قمر رئیس)

ہندوستان سے فون آیا ہے۔ دوسری طرف سے ہماری بیوی کی آواز آئی تو ہم نے بے ساختہ پوچھا۔ 'کیسی ہو؟ خیریت سے تو ہونا؟'

ہماری بیوی نے کہا۔ 'میری خیریت جائے بھاڑ میں۔ پہلے یہ بتلاؤ اس وقت کمرے میں اکیلے ہو یا وہ بھی تمہارے ساتھ ہے۔'

ہم نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔ 'وہ کون؟ میں تو کمرے میں اکیلا رہتا ہوں۔ کیسی باتیں کرتی ہو۔ میری غریب الوطنی کا تو خیال کرو۔ پھر ایسی باتیں کرنے کے لئے کئی سمندر پار سے فون کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'

بولیں، 'یہ تمہاری آواز میں اتنا خمار کیوں ہے؟ ایک عجیب سی مستی کیوں ہے؟'

ہم نے کہا، 'رات کے ڈیڑھ بجے ہیں۔ تمہارے فون کی گھنٹی پر جاگے ہیں۔ گہری نیند میں کیا اتنا خمار اور اتنی مستی بھی نہ آئے گی؟'

بولیں، 'بالکل غلط۔ اس وقت تو رات کے صرف دس ہی بجے ہیں۔'

ہم نے بات کو کاٹ کر کہا، 'ٹھیک ہے۔ ہندوستان میں دس بجے ہوں گے مگر یہاں تو رات کا ڈیڑھ بجا ہے۔'

بولیں، 'مجھے معلوم ہے کہ اب تمہارا وقت اور میرا وقت کبھی نہیں ملے گا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔ تمہارے لہجہ کی سرشاری بتا رہی ہے کہ وہ چنڈال اب بھی تمہارے ہی کمرے میں ہے۔'

ہم نے غصہ سے کہا۔ 'یہ کیا مذاق ہے۔ تم کس چنڈال کا ذکر کر رہی ہو۔ جاپان میں کوئی چنڈوال ونڈال رہتی۔'

'وہی چنڈال جس کے بارے میں تم نے خود اپنے خط میں لکھا ہے کہ وہ تمہیں ٹوکیو میں دوسرے دن ہی مل گئی تھی۔ دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے۔ اب ہمیں اسی کی رفاقت میں ٹوکیو کے شب و روز گزارنے ہیں۔'

ہم نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ 'تم سچ مچ بڑی بھولی ہو۔ ٹوکیو میں جو ہمیں دوسرے دن ملی وہ کوئی حسینہ نہیں بلکہ یونیسکو کی چھتری ہے۔ رومیں شائد ہم چھتری لکھنا بھول گئے اور تم نے اس کا رشتہ عورت سے جوڑ لیا۔'

پوچھا، 'اچھا تو یہ چھتری ہے؟'

ہم نے کہا، 'اور کیا؟'

پوچھا، 'اچھا تو یہ بتاؤ کہ چھتری شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ؟'

ہم نے کہا، 'بھلا چھتریوں کی بھی کہیں شادی ہوتی ہے؟'

بولیں، 'اس کا مطلب یہ ہے کہ شادی شدہ نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کہ عمر کیا ہے؟'

ہم نے کہا، 'بڑی پرانی چھتری ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی لوگ اسے استعمال کر چکے ہیں۔'

بولیں، 'اے ہے کچھ تو اپنی عمر کا لحاظ کرو۔ اب تمہیں کون سی غیر مستقل چیز ملے گی۔ مرد کی ذات ہی ایسی ہوتی ہے، رسی جل جاتی ہے پر بل نہیں جاتا۔' پھر اپنے لہجے میں غمگینی اور رقت طاری کرتے ہوئے بولیں، 'خدا کے لئے راہِ راست پر آ جاؤ، تمہاری اولاد اب شادی کے قابل ہو رہی ہے اور تمہیں اب بھی نئی نئی چھتریوں کی تلاش ہے۔' ہم نے کہا، 'تمہارا الزام بالکل غلط ہے۔ یہاں ایسا کوئی سلسلہ نہیں۔ میں نے اپنے خط میں جس کا ذکر کیا ہے۔ وہ سچ کی چھتری ہے۔ کہو تو تمہارے سر کی قسم کھاتا ہوں جسے میں نے ہمیشہ عزیز رکھا ہے۔' بولیں، 'اچھا تو تم میرے سر کی عزت کرتے ہو۔ تبھی تو میرے سر پر ایک نئی چھتری لا رہے ہو۔ یہ کہہ کر ہماری بیوی نے دھڑ سے فون رکھ دیا۔'

یونیسکو کی چھتری کو لے کر مجتبیٰ نے میاں بیوی کی تکرار کی آڑ میں لفظوں کے جو شگوفے چھوڑے ہیں اور رنگ آمیزی کی ہے اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی حس مزاح کس قدر تازہ اور توانا ہے۔ عورتوں کی شکوہ سنجی اور تشکیک کی نفسیات بھی اس طور نمایاں ہوتی ہے کہ اندیشہ ہائے سود و زیاں سے مردوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں مگر اس خبر گیری اور خبرداری کے باوجود ظرافت کی زیریں لہر اپنا جادو جگاتی رہتی ہے۔

مجتبیٰ کی شخصیت کی تشکیل ہزار رنگوں سے ہوئی ہے۔ ان کی ذہانت اور فطانت پر ہمیں رشک آتا ہے۔ جاپان جانے لگے تو انہوں نے چند دوستوں سے فرمائش کی کہ وہ انہیں جاپانی مصوروں کی بنائی ہوئی تصویروں کے پرنٹ فراہم کرا دیں اور پینٹرس کے ناموں کی فہرست بھی۔ ٹوکیو پہنچتے ہی جاپانیوں کی محفل میں انہوں نے وہاں کے مصوروں کے بارے میں اپنی معلومات کا پٹارہ کھولا تو شریف جاپانی دھوکے سے انہیں آرٹ کرٹیک سمجھ بیٹھے۔

جاپان کے نامور آرٹسٹوں کے ساتھ ان کی ملاقاتوں کا اہتمام کیا گیا۔ ایک جاپانی دوست کے ذریعہ ان کی ملاقات مشہور آرٹسٹ جوڑے ماروکی ایڈی اور ماروکی یوشی سے ہوئی۔ دونوں نے زندگی بھر ہیروشیما کی تباہ حالی کو پینٹ کیا ہے۔ ان کے میوزیم میں ہیروشیما کی بربادی کی پینٹنگس دیکھ کر بیحد مضطرب ہوئے۔ ہیروشیما پر بم گرنے سے دو لاکھ ساٹھ ہزار لوگوں کی جانیں گئی تھیں اور اس سانحہ کو آرٹسٹ جوڑا زندگی بھر پینٹ کرتا رہا تھا اور نوسو کے قریب تصویریں بنانے کے باوجود اس ٹریجڈی کو مزید پینٹ کرنا چاہتا تھا۔ ان کی عمریں اسی اور ستر کو پہنچ چکی تھیں مگر تصویریں بنانے کا سودا اور جنون ان کے جسم و روح میں سما چکا تھا۔

جاپانیوں کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ وقت ضائع نہیں کرتے۔ انہیں جب اور جہاں موقع ملتا ہے وہ کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔ وہاں ہر سال تقریباً ساڑھے چھ کروڑ سے زیادہ کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ اگر آپ جاپان نہیں جانا چاہتے تو آپ یہ سفرنامہ پڑھئے، آپ سیراب ہو جائیں گے اور اگر آپ جاپان

جانا چاہتے ہیں تو یہ بھی سفرنامہ پڑھیے، وہاں پہنچ کر آپ کو کسی گائڈ کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔

مجتبیٰ اسکول کے زمانے سے لذت تقریر کے ہنر آشنا ہیں اور خطابت کا فن ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ گانے کے بھی شوقین ہیں۔ جاپان جا کر وہ پورے گلوکار بن گئے۔ آخر آخر میں ان کا تعارف ایک ہندوستانی گلوکار کی حیثیت سے کرایا جانے لگا۔ ایک ریستوراں کی مالکہ ان کے گانے سے ایسی مسحور ہوئیں کہ ان کے کھانے کا بل نہیں لیا بلکہ ان کے آٹوگراف لے کر نمایاں جگہ پر لگا دئے اور اس کے نیچے جاپانی میں لکھ دیا کہ ہندوستان کا ایک مشہور گلوکار اس ریستوراں میں آیا تھا۔ کسی جاپانی نے مجتبیٰ سے پوچھا لیا کہ موسیقی کی تعلیم انہوں نے کس سے حاصل کی؟ ان کے ذہن میں محض اتفاقی طور پر بڑے غلام علی کا نام آیا اور برجستہ طور پر انہوں نے ان کا نام لے دیا۔ مجتبیٰ حسین سُر میں گاتے ہی نہیں لکھتے بھی سُر میں ہیں اور ایسی مرکیاں لیتے ہیں کہ وہ لکھا کریں اور آپ پڑھا کریں۔

اس رات موصوف نے اپنی گائیکی کے فن میں اپنے بیش بہا کمالات کا ایسا غیر معمولی مظاہرہ کیا کہ وہ مست و بیخود ہو کر ان کے ساتھ رقص کرنے لگیں اور جب کھانے کا وقت آیا تو سب گیشاؤں نے مل کر اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے ان کے نرم و نازک ہاتھوں سے ان کے منہ میں لقمے دینا شروع کئے۔ کھانے کے بعد مجتبیٰ جب بھی سگریٹ جلانا چاہتے تو کوئی گیشا گرل آگے بڑھ کر سگریٹ جلا دیتی تھی۔ اب بھلا اس سے زیادہ کسی گلوکار کی تعظیم و تکریم اور کیا ہو سکتی ہے۔ آگے کا حال مجتبیٰ نے سپردِ قلم نہیں کیا۔ ویسے گیشائیں اپنے پسندیدہ لوگوں کو گود میں بٹھا کر کھانا کھلاتی ہیں اور مساج بھی کرتی ہیں وہ بھی ایسا جسے آدمی زندگی بھر نہیں بھولتا۔

مجتبیٰ اپنی تمام تر خواد فراموشیوں کے باوجود کروٹیں لیتی ہوئی دنیا کے نشیب و فراز پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ سوویت روس جب زوال کے کگار پر تھا، رات میں جب وہ اپنے ہوٹل میں سونے کی تیاری کر رہے تھے، ان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ انہوں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ خمار سے بھری ہوئی روسی لڑکی ان کے التفات کی طلبگار تھی۔ اسے میٹھی شراب اور سگرٹوں کی ضرورت تھی۔ وہ کچھ ڈالر بھی چاہتی تھی۔ مجتبیٰ نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ کہیں اور قسمت آزمائے۔ ان کے کمرے میں پہلے ہی سے کوئی موجود ہے۔ لڑکی پیر پٹختی ہوئی واپس لوٹ گئی اور مجتبیٰ یہ سوچ کر مغموم ہو گئے کہ گورباچوف کے دورِ اقتدار میں جوان لڑکیا اپنا پیٹ بھرنے کے لئے جسم بیچنے پر مجبور ہیں اور پھر ہوا بھی وہی۔ سوویت یونین کے حصے بخرے ہو گئے اور مارکس کا نظریاتی فلسفہ شکست ہو گیا۔ سچا مزاح نگار آپ کو ہنسا کر دنیا کی ناہمواریوں پر خود آنسو بہاتا ہے کہ تسکین حال کے لئے رونا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

مجتبیٰ کے خاکوں کی کتاب میں یوں تو ہر خاکے بے مثال ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ یہ دنیا چھوڑ کر چلے گئے۔ ان میں بے شمار ادیب و شاعر شامل ہیں۔ وہ اپنی تخلیقات میں زندہ رہیں نہ رہیں، مجتبیٰ کے خاکوں میں وہ ضرور غیر فانی ہو چکے ہیں۔ یہاں ہم قوالی کی ملکہ پر لکھے گئے مجتبیٰ کے غیر معمولی خاکے کے حوالے سے کچھ عرض کرنا چاہیں گے۔ شکیلہ کا شہرہ یوں تو ساری دنیا میں تھا مگر وہ حیدرآباد یو میں بیحد مقبول تھیں۔ وہاں کا بچہ بچہ ان کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ ان میں بزرگ بھی شامل تھے جو شکیلہ بانو بھوپالی کی قوالی سن کر وجد میں آجاتے تھے اور رقص بسمل شروع کر دیتے تھے۔ علی گڑھ کی نمائش میں ہم نے انہیں ان کی تمام تر اداؤں، عشووں اور غمزوں کے ساتھ دیکھا تھا۔

مخدوم کی نظم 'ایک چنبیلی کے منڈوے تلے دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے' کی زندہ اور تابندہ پیشکش دیکھ کر ہزاروں کا مجمع داد و تحسین سے آسمان سر پر اٹھا لیتا تھا۔ وہ جب بھی حیدرآباد تشریف لاتیں، 'سیاست' کے میر عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر کی خدمت عالیہ میں حاضری دینا لازمی جانتیں۔ مخدوم محی الدین پر بھی وہ جان چھڑکتی تھیں اور خود مخدوم بھی ان سے اور ان کے قوالی کے فن سے بیحد متاثر تھے۔

حیدرآباد ہی کے ایک نوجوان مصنف اکمل حیدرآبادی نے شکیلہ بانو کی فتنہ انگیزی اور فسوں خیزی سے متاثر ہو کر پانچ سو صفحہ کی کتاب لکھ ڈالی جسے ادارہ 'شمع' کے ملک و مدیر حافظ یوسف دہلوی نے نہایت جذب و کشش کے ساتھ شائع کر کے اپنی بے پناہ محبت کا ثبوت دیا۔ حافظ صاحب شکیلہ کا کلام بھی نہایت تزک و احتشام کے ساتھ شائع کرتے تھے۔

مجتبیٰ کا بے بدل خاکہ آخر میں ہمیں بیحد مغموم کر گیا۔ زندگی کے آخری ایام شکیلہ نے تنگی اور عسرت

> جہاں تک طنز و مزاح کا تعلق ہے، یہ عام فہم حقیقت ہے کہ مزاح اور طنز میں بنیادی فرق ہوتا ہے۔ طنز نگاری اپنی جگہ اور مزاح نگاری دوسری جگہ۔ طنز کی عمارت نفرت کی اساس پر تعمیر کی جاتی ہے۔ ادھر مزاح نگاری میں محبت اور ہمدردی ناگزیر ہوتی ہے اور اسی لئے ایک مزاح نگار کا ناول بھی محبت اور ہمدردی سے بھرا ہوا ہوتا ہے اور ہونا بھی ضروری ہے۔ یہاں ان کی ایک تصنیف 'آدمی نامہ' کو دیکھیے۔ اس میں پندرہ ایسی شخصیتوں کے خاکے پیش کئے گئے ہیں کہ ہر ایک ہمارے لئے رہبر زندگی بن سکتا ہے۔ ان پندرہ خاکوں کو پڑھ کر ہمارے دل کو بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس میں طنز کی ذرہ بھر بھی بے دردی نہیں ملتی اور اسی مسرت آفرینی کے فن میں مجتبیٰ حسین یکتا فنکار ہیں۔ بس مجھے افسوس ہے کہ 'آدمی نامہ' میں سولہویں شخصیت کے لئے جگہ نہیں محفوظ رکھی گئی ہے۔ اصل میں وہ جگہ بحیثیت مزاحیہ آدمی خود مجتبیٰ صاحب کے لئے ہونی چاہئے۔
>
> **(پروفیسر گوپی سوزوکی تاکیشی، جاپان)**

میں گزارے۔مختلف بیماریوں کی یلغار نے انہیں عاجز کر دیا تھا۔ وہ بدن جو کبھی بجلی بن کر اداؤں کے خنجر چلاتا تھا، مائل بہ زوال تھا۔قوالی کے فن کو ایک نئی نہج اور سمت دینے والی عظیم ترین فنکارہ اپنی موت کے ساتھ ہی گوشۂ گمنامی میں چلی گئی۔ واحسرتا! یہ کیسی دنیا ہے کہ اپنے جانے والے فنکاروں کے شایان شان ماتم بھی نہیں کرتی اور انہیں اس طرح فراموش کر دیتی ہے جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ خدا مجتبیٰ کو لمبی 'حیاتی' دے کہ جن کے لکھے ہوئے خاکے نے ہماری سوئی ہوئی یادوں کو جگا دیا۔قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کا یہ البیلا شہر شعروادب کا قابل رشک مرکز بھی ہے۔ یہاں کے مخدوم، زور، عبدالقادر سروری، سیدہ جعفر، حیرت بدایونی، جیلانی بانو، عوض سعید، اقبال متین، سلیمان اریب، شاذ تمکنت، شاہد صدیقی، وحید اختر، عزیز قیسی، یوسف سرمست، خورشید احمد جامی سبھی سے ہماری یاداللہ تھی۔

یہاں ڈپٹی نذیر احمد اور ان کے صاحبزادے بشیر احمد نے بھی خاصہ وقت گزارا تھا۔ جوش ملیح آبادی شاعر تو بڑے تھے مگر وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ملیح آبادی پٹھان بھی تھے۔ انہوں نے نظام حیدرآباد کی شان میں سوقیانہ شعر کہہ دئے اور انہیں چوبیس گھنٹے کے اندر در بدر ہونا پڑا۔ یہاں فانی نے بھی خاصہ وقت گزارا۔ اس زرخیز ادبی مرکز میں حضرت داغ کا بھی ورود مسعود ہوا جو ستر برس کی پختہ عمر میں اپنے محبوب سے ملاقات کی خاطر حاضر ہوئے تھے۔ ہم سے پوچھئے تو حیدرآباد کی شناخت چار مینار ہے اور چار مینار کی شناخت مجتبیٰ حسین ہیں جن کی غیر معمولی مزاح نگاری کا ڈنکا ایشیائی ممالک کے علاوہ یورپ، امریکہ، فرانس اور جاپان میں بھی بج رہا ہے اور بقول مشفق خواجہ جہاں نہیں بجتا وہاں وہ خود اپنا ڈنکا بجانے بہ نفس نفیس پہنچ جاتے ہیں۔

مجتبیٰ ہم سے عمر میں بڑے ضرور ہیں لیکن ہم نے ان سے پہلے خامہ فرسائی شروع کر دی تھی۔ سلیمان اریب نے غالباً 59-58 میں ہماری خاصی بڑی کہانی 'اندھیرے کا پھول' اپنے موقر صحیفے 'صبا' میں شائع کر کے ہمیں شاد کیا۔ آج کے عالم بے بدل شمس الرحمن فاروقی کا پہلا مضمون بھی اسی موقر جریدے میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ کچھ سالوں کے فرق سے مجتبیٰ نے صریر خامہ سے وہ کام لیا کہ شہرت ان کے گھر کی لونڈی بن گئی۔ ان کے قلم میں وہ تمام تر صباحتیں اور نزاکتیں ہیں جو عام طور پر کمسن خواتین کے حسن بے پروا میں پائی جاتی ہیں۔ شاید صدیقی کے انتقال کے بعد ان کا فکاہیہ 'شیشہ وتیشہ' لکھنے کی دعوت مجتبیٰ حسین کو دی گئی۔ یہ اگست ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ پھر اس کے بعد انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ انہوں نے اپنی رمزیاتی تحریر سے ایسی شمع فروزاں کی جس نے ادب کی تاریک راہوں کو وہ ضوفشانی بخشی جو اپنی مثال آپ ہے۔مجتبیٰ کا مزاح اپنی شائستگی، نرمی، شگفتگی، برنائی اور شوخی کے لئے تادیر یاد رکھا جائے گا۔

مجتبیٰ کی ادبی تربیت میں جگر صاحب کے علاوہ ابراہیم جلیس اور ابن انشاء نے غیر شعوری طور سے حصہ لیا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ مجتبیٰ نے اپنا اسلوب خود ایجاد کیا ہے جو ان سے شروع ہو کر خود ان پر ختم ہوتا ہے۔ بلا شبہ مجتبیٰ صاحب طرز ادیب ہیں۔ ان کے انشائیے، خاکے اور افسانہ نما کالم اور سفرنامے زبان و بیان، شستگی اور شفافیت کا ایسا اظہاریہ ہیں جس سے ان کے انفراد اور امتیاز کا بخوبی احساس ہوتا ہے۔ وہ حرفوں کی ایسی کائنات تشکیل دیتے ہیں جو ہمیں اس حیرت سرائے میں زندہ دلی کے ساتھ جینے اور زندگی کے گرنے کے گُر سے آشنا کرتی ہے۔مزاح کی تزئین وآرائش کے لئے وہ خود کو بھی نشانۂ ستم بنانے سے گریز نہیں کرتے۔

ان کے کالموں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خود کو محض حالات حاضرہ کے سپاٹ بیانئے تک محدود نہیں رکھتے۔ وہ تہذیبی، تاریخی اور سماجی حقائق کو ایک مصور کی طرح مزاح کے رنگ و روغن سے سنوارتے سجاتے ہیں کہ بنیادی طور پر ان کا مطمح نظر سیر جہاں کے ساتھ ساتھ جہاز تازہ کی تخلیق بھی ہوتا ہے۔ ان کی خاکہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ وہ جن شخصیتوں کی پیکر تراشی کرتے ہیں وہ اپنی تمام تر خوبیوں اور کج اداؤں کے ساتھ قاری سے مکالمہ کرتی نظر آتی ہیں۔

این سی آر ٹی میں جب مجتبیٰ دلی آئے تو مخمور سعیدی، امیر قزلباش اور کمار پاشی ان کے دن و رات کے ساتھی تھے۔ ان یار باشوں سے ہماری بھی خوب چھنتی تھی۔مجتبیٰ کافی ہاؤس کے مستقل آنے والوں میں تھے۔ اس طور فکر تونسوی، گوپال متل، کرشن موہن، دیویندر ستیارتھی، ہانی، بلراج ورما، بلراج مینرا، سریندر پرکاش، محمود ہاشمی، دیناناتھ گاندھی، اندر سروپ دت نادان، محمود ہاشمی، یعقوب عامر، انوار رضوی پنجابی اور انگریزی کے مشہور افسانہ نگار ستیندر سنگھ اور مشہور سنگتراش سہگل شام ہوتے ہوتے کافی ہاؤس میں جمع ہو جاتے تھے۔ ادب اور شاعری کے ساتھ ساتھ دنیا جہاں کے موضوعات پر سنجیدہ اور غیر سنجیدہ گفتگو کا دور جاری رہتا تھا۔ بل کی ادائیگی اکثر و بیشتر گوپال متل یا پھر کرشن موہن کرتے تھے۔

کافی ہاؤس کے بعد مجتبیٰ کا دوسرا ٹھکانہ پریس کلب تھا۔ جب تک ہم دلی میں رہے، انہیں کہیں نہ کہیں ڈھونڈھ ہی لیتے تھے۔ ریڈیو کشمیر میں تقرری بعد ہم حسن وعشق کی وادی سری نگر میں منتقل ہوئے تو وہاں بھی مجتبیٰ اپنی بذلہ سنجی کا مظاہرہ کرنے چلے آئے۔ ریڈیو کے ڈائرکٹر کے کے نیر تھے۔ ان کی فہمائش پر ہم نے مجتبیٰ کے ساتھ ایک ادبی محفل کا اہتمام کیا۔ شرکائے محفل میں ڈراما پروڈیوسر پران کشور، خود نیر صاحب، ہ اور غالباً بشیر شاہ بھی تھے۔ خیال پڑتا ہے کہ زبیر رضوی بھی تھے۔ اس غیر رسمی محفل میں ہر طرح کے سوالوں کی

چھوٹ تھی۔ نیر صاحب اپنی ظرافت اور طباعی سے محفل میں رنگ جما دیتے تھے۔ مجتبیٰ آداب سے بھی کما حقہ آشنا تھے۔ ہم سب نے مل کر مجتبیٰ کو طنز و مزاح کے حوالے سے لپیٹنے کی بہت کوشش کی مگر صاحب توبہ کیجئے، انہوں نے رمز و کنائے کے وہ گل کھلائے کہ ہم سب کو چت کر دیا۔ ہم نے کہا کہ آپ دنیا بھر میں مٹر گشتی کر آئے، اس کا آپ کو کیا فائدہ ہوا؟ انہوں نے برجستہ کہا، 'ہم دنیا کو نفع و نقصان کی ترازو میں نہیں تولتے۔ ہم تو اس مسخرے کی طرح ہیں جو دنیا بھر کو ہنساتا ہے مگر جسے خود ہنسنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ یہی کارِ مشکل برسوں سے ہم بھی انجام دے رہے ہیں۔ خود ہنسیں نہ ہنسیں، دنیا کو ہنساتے رہتے ہیں کہ اس رنگ بدلتی دنیا میں نجات و برأت کے لئے شگوفہ گوئی کے ہنر کو آزماتے رہنا چاہئے۔'

کشمیر سے ہمارا تبادلہ ممبئی ہو گیا۔ مجتبیٰ سے بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی کیونکہ وہ دنیا کے سفر پر نکلے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ان کی واپسی ہوئی ہم نے آل انڈیا ریڈیو بمبئی کے آڈیٹوریم میں مدعو سامعین کے روبرو طنز و مزاح کانفرنس کا اہتمام کیا۔ یوسف ناظم کو بھی ہم اس طرح خوش کرنا چاہتے تھے۔ انہیں سے مزاح نگاروں کی فہرست مرتب کرائی۔ مقامی مزاح نگاروں کے علاوہ زندہ دلان حیدرآباد کے خاصان مزاح حضرات کو دعوت دی گئی۔ مسیح انجم، مصطفیٰ کمال، پرویز یداللہ مہدی کے علاوہ بطور خاص دلی سے مجتبیٰ کو مہمان خصوصی کے طور پر بلایا گیا۔ لکھنؤ سے وجاہت علی سندیلوی آئے تھے۔ انشائیہ نگار رام لعل نابھوی شریک بزم تھے۔

غرض کہ ریڈیو کی تاریخ میں ایسی زعفران زار محفل کا انعقاد پہلی بار ہوا تھا اور (شاید آخری بار بھی) اردو اخبارات کو چھوڑیئے، ہندوستان بھر کے انگریزی اخباروں نے اس پر مزاح کانفرنس کی تفصیلی رپورٹ شائع کر کے ہماری چھتیس انچ کی چھاتی کو چھپن انچ کی چھاتی میں تبدیل کر دیا۔

یوں تو مجتبیٰ خاصے ہر دلعزیز ہیں مگر وہ ہمارا دل بن کر ہمہ وقت دھڑکتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ لکھنؤ، دلی، سری نگر اور بمبئی میں ملاقاتوں کا سلسلہ تواتر کے ساتھ جاری رہا۔

ابھی حال ہی میں حیدرآباد میں بیدی پر ساہتیہ اکادمی کی جانب سے سیمینار کا انعقاد ہوا تو نارنگ صاحب کی مہربانی سے ہم بھی مدعو کر لئے گئے۔

ہم خوش تھے کہ یاران میکدہ سے لمبے لمبے ہاتھ کرنے کا خوب موقع ملے گا۔ سیمینار میں ہماری آنکھیں مجتبیٰ حسین کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ قمر جمالی، رؤف خیر اور بیگ احساس سے بالمشافہ خوب ملاقاتیں اور گھاتیں رہیں۔ بیگ احساس نے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ مجتبیٰ سے ملنے کے لئے وہ ہمارے ساتھ ہم رکاب ہوں گے مگر ان کا گھوڑا بدک کر کہیں اور جا پہنچا اور ان کا وعدہ محبوب کا وعدہ ثابت ہوا اور ہم چاند چہرہ ستارہ آنکھوں والے اپنے جگری یار کا دیدار نہ کر سکے۔

> مجتبیٰ حسین کی تشبیہات میں بڑی تازگی اور انفرادیت ہوتی ہے۔ ان کی تشبیہات بالعموم موضوع اور نفس مضمون سے مناسبت رکھتی ہیں۔ اسی کے ساتھ رعایت الفاظ بھی ملحوظ رہتی ہے۔ باقی جدید دور کے ایک بلند مرتبہ غزل گو شاعر تھے۔ وفات سے پہلے طویل علالت کا شکار رہے۔ ان کے ایک مجموعۂ کلام کا نام 'حساب رنگ' ہے۔ مجتبیٰ حسین نے ایک خاکے میں باقی کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے:
>
> 'باقی ان دنوں چھوٹی بحر کا مصرع بن گئے تھے۔ ہاتھ میں ایک چھڑی آ گئی تھی جو اس مصرع کو وزن سے گرنے نہیں دیتی تھی۔ چھڑی کیا تھی، اچھی خاصی ضرورتِ شعری تھی۔ اس وقت باقی کے حسابِ رنگ میں ایک ہی رنگ جڑا ہوا تھا اور وہ تھا زرد رنگ۔ یوں لگتا تھا جیسے باقی باقی نہیں ہلدی کی گانٹھ ہیں۔'
>
> (مغنی تبسم)

اکیڈمی والوں نے شیڈول اتنا ٹائٹ رکھا تھا کہ جس شام ہمارا پیپر تھا اسی رات ہمیں لکھنؤ کے لئے رختِ سفر باندھنا تھا اور ہم دھیّا چھو کر لوٹ آئے۔

مئی ۱۹۹۳ء میں ہماری پوسٹنگ اسٹیشن ڈائرکٹر کی حیثیت سے گلبرگہ شریف میں ہوئی تو ہم نے سب سے پہلے حضرت بندہ نواز گیسو دراز کی قدمبوسی کے لئے ان کے آستانے پر حاضری دی۔ حضرت بندہ نواز ٹرسٹ گلبرگہ میں کئی میڈیکل کالج اور انجینئرنگ کالج چلاتا ہے۔ تعلیم یہاں اس قدر عام ہے کہ ہمارا سرکاری ڈرائیور نہایت شستہ حیدرآبادی اردو میں گفتگو کرتا تھا۔ فرفر انگریزی بھی بول لیتا تھا۔ شروع شروع میں ہمارا ایک قیام ایک گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ سب سے پہلے ہمیں حامد اکمل نے دریافت کیا۔ یہیں ہماری ملاقات خمار قریشی، حمید سہروردی اور گلبرگہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ راہی قریشی سے ہوئی۔ وہاں عندلیب نے بھی شرف ملاقات بخشا۔

یہاں کے لوگوں کی شرافت اور نیک نفسی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ ہمیں ایک دن بھی ایسا نہیں لگا کہ ہم کسی اجنبی شہر میں آئے ہیں۔ گلبرگہ کو اگر منی حیدرآباد سے تعبیر کیا جائے تو حرف بہ حرف درست ہوگا۔ بولی ٹھولی سے لے کر خورد و نوش تک حیدرآبادی رنگ کھلا ہوا تھا۔ اردو کا یہاں خوب بول بالا ہے۔

اسی مردم خیز چھوے سے قصباتی شہر میں ۱۵ر جولائی ۱۹۳۶ء کو روتا ہوا ایک بچہ پیدا ہوا جس کے رونے پر ہنسی کا گمان ہوتا تھا اور یہ کوئی اور نہیں مجتبیٰ حسین تھے جن کے طنز و مزاح کا شاہی نقارہ پوری دنیا میں گونج پیدا کر رہا ہے۔

❑❑❑

مجتبیٰ حسین

بیگ احساس

8-1-398/PM/416
یاسر انکلیو، فلیٹ نمبر 401
پیراماؤنٹ ہلس، ٹولی چوکی
حیدرآباد
رابطہ: 9849256723

مخدوم محی الدین کے بعد مجتبیٰ حسین وہ واحد فنکار ہیں جنہیں حیدرآبادیوں نے ٹوٹ کر پیار کیا۔ جو بات انہوں نے مخدوم صاحب کے بارے میں لکھی تھی وہ ان پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے۔ 'مخدوم کو حیدرآباد سے بے پناہ پیار تھا جسے وہ ہمیشہ وطن مالوف کہا کرتے تھے۔ حیدرآباد مخدوم کے اندر تھا اور مخدوم حیدرآباد کے اندر۔ حیدرآباد کی گلی گلی میں ان کے چرچے تھے۔ حیدرآبادیوں نے انہیں ٹوٹ کر چاہا بھی۔'

کتنے ہی لوگ ہیں جو ملک کے مختلف حصوں سے حیدرآباد آگئے اور یہاں کے ہو کر رہ گئے۔ مجتبیٰ حسین حیدرآباد سے جا کر دلی میں بس گئے۔ گو ان کا دل اب بھی یہاں ہے۔ مجتبیٰ حسین کی کسی کتاب کی رسم اجراء کے موقع پر گوپی چند نارنگ صاحب نے کہا تھا:

ڈھائی سو سال پہلے ارض دکن سے غزل کا شہزادی ولی دکنی دہلی آیا تھا۔ اب ڈھائی سو سال بعد ارض دکن سے مزاح کا شہزادہ دلی آیا ہے اور اس کے آتے ہی مزاحیہ ادبی محفلوں میں ایک جان سی پیدا ہوگئی ہے۔

اس بات کو یوسف ناظم نے بھی کچھ اس طرح لکھا تھا:

'یوں تو شمالی ہند سے ادیب و شاعر بہ کثرت الٰہ آباد آتے رہے لیکن دکن سے کسی ادیب کا دلی جا کر بس جانے کا تاریخ ادب اردو میں یہ پہلا واقعہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو کے شروع شروع کے دنوں میں ولی دکنی شمالی ہند گئے تھے۔ وہ خالص دکنی تھے۔ یہ بات اہل گجرات آج تک نہیں مانتے۔'

ولی اورنگ آبادی تھے یا ولی گجراتی، اس سلسلے میں ہمیشہ اختلاف رہا۔ مجتبیٰ حسین کے سلسلے میں بھی ایسا جھگڑا ہو سکتا ہے کیونکہ مجتبیٰ حسین چنچولی ضلع گلبرگہ (کرناٹک) میں پیدا ہوئے۔ راجوری ضلع عثمان آباد (مہاراشٹر) ان کا آبائی وطن ہے۔ تانڈور (آندھرا پردیش) سے میٹرک کیا۔ گلبرگہ سے انٹرمیڈیٹ اور حیدرآباد سے گریجویشن لیکن خدا کا شکر ہے یہ سارے علاقے پرانی ریاست حیدرآباد سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے کسی مسئلے کے پیدا ہونے کی گنجائش نہیں ہے۔

مجتبیٰ حسین نے شروع ہی سے اونچے خواب دیکھے، ہمیشہ اونچا سوچا اور اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈھی، ان کے حوصلے بلند رہے۔ انٹرمیڈیٹ میں جب وہ پڑھتے تھے تو وہ بزم اردو کے جنرل سکریٹری تھے۔ انہوں نے گلبرگہ میں ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا جس میں مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی، جگن ناتھ آزاد، سلیمان اریب

اور شاہد صدیقی جیسے شاعر شریک ہوئے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی آئے تو بزم اردو کے جنرل سکریٹری بنے تو شاندار کانفرنس منعقد کی۔ کرشن چندر کو بلوایا۔ اسی اسٹیج سے راجندر سنگھ بیدی نے بھی صدارت کی۔ تمام مزاح نگاروں کو ایک اسٹیج پر لے آئے۔ وہ مجتبیٰ حسین جنہوں نے کبھی سلیمان اریب کا آٹوگراف لیا تھا وہ اریب سے اتنے قریب ہو گئے کہ مخدوم کے بھی چہیتے بن گئے۔ احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی بات کو کس طرح سے کہنا چاہئے، یہ فن مجتبیٰ حسین نے خوب سیکھا۔ مجتبیٰ نے یہ ترقی یوں ہی نہیں کی۔ بارہ بارہ بلکہ اٹھارہ گھنٹے اخبار کے دفتر میں خون جلایا۔ بے پناہ محبت کی لیکن ہمیشہ ہنستے اور مسکراتے رہے۔ شاہد صدیقی کے انتقال کے بعد محبوب حسین جگر صاحب کے حکم پر 'کوہ پیما' کے نام سے کالم 'شیشہ و تیشہ' لکھا۔ اپنا خون جگر ایسا جلایا کہ عبد الماجد دریا آبادی جیسے جید مولوی اور صاحب طرز ادیب نے ان کے کالم کی تعریف کی۔

لوگ کہتے ہیں انہیں پشت پناہی حاصل رہی۔ لیکن اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ موقع ملنے کے بعد خود کو ثابت کرنا کمال ہے۔ بغیر صلاحیت کے کوئی آگے نہیں بڑھ سکتا ورنہ بڑے بڑے اداکاروں کے بیٹے شاندار انداز میں لانچ کئے جانے کے باوجود یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہتے۔ مجتبیٰ حسین نے جو کچھ حاصل کیا، اپنے فن کے بل پر اور اپنے حسن اخلاق سے حاصل کیا۔ وہ کبھی منظر نامے سے غائب نہیں ہوئے۔ انہوں نے خود کو منوایا۔ انہوں نے ایسا رویہ اپنایا کہ لوگ انہیں چاہنے پر مجبور ہو گئے۔

شمال میں حیدرآبادیوں اور بہاریوں کو احمقانہ حد تک سادہ لوح سمجھا جاتا ہے۔ بقول وحید اختر:

''بہاری اپنی جارحانہ مقامی عصبیت کی بنا پر ہدف طنز بنتے رہے اور حیدرآبادی اپنے ضرورت سے زیادہ غیر جارحانہ، مرنجاں مرنج، صلح کن اندازِ معاشرت کی وجہ سے ضعیف الارادہ و ضعیف الفہم سمجھے گئے۔''

مجتبیٰ حسین اس کے برعکس ثابت ہوئے۔ وہ دلی والوں کے لئے ناگزیر بن گئے۔ مجتبیٰ حسین نے دلی والوں کو مفلوج بنا دیا۔ اتنا مفلوج کہ بغیر مجتبیٰ کے نہ ان کی ضرورتیں پوری ہو سکتی تھیں اور نہ ادبی محفلیں۔ تعزیتی جلسوں تک میں مجتبیٰ حسین نے اپنے مخصوص انداز میں خاکے سنائے۔ سننے والے شش و پنج میں مبتلا ہو گئے کہ انہیں قہقہہ لگانا چاہئے یا خاموش رہنا چاہئے۔ جب وہ مجبور ہو کر ہنسنے لگتے تو مجتبیٰ اپنے خاکوں کو ایسے موڑ پر لے آتے کہ لوگ ہنستے ہنستے اچانک رونے پر مجبور ہو جاتے۔ بنے بھائی کی تعزیتی جلسے میں ایسی ہی سچویشن ہو گئی تھی۔

مجتبیٰ نے محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ میں کام کیا تھا۔ اس کی چھاپ ان کی شخصیت پر ایسی گہری ہے کہ وہ جہاں بھی رہے ان کے پاس ادیبوں کے بارے میں تازہ اطلاعات ہوا کرتی ہیں اور تعلقات عامہ بنانے اور نبھانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ دلی کا ہر شخص اس بات کا معترف ہے کہ مجتبیٰ حسین کے تعلقات شیو شنکر، اندر کمار گجرال اور رحمت علی سے لے کر حیدرآباد ہاؤز کے چپراسیوں تک سب سے مجتبیٰ حسین کے تعلقات تھے۔ مجتبیٰ حسین جب تک اسکوٹر سے سفر کرتے رہے، تمام ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھا۔ سب ایک تھے شیر و شکر کی طرح۔ آج مجتبیٰ گھر بیٹھے ہیں تو وہ ایک دوسرے کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہیں۔ دلی جائیں ایک سے ملاقات کریں تو دوسرا ناراض۔ ان کو جوڑے رکھنے والی درمیانی ڈور اب سمٹ کر رہ گئی ہے۔

دلی میں مجتبیٰ حسین کے اسکوٹر کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ مجتبیٰ حسین کی اس اسکوٹر کو تاریخی اہمیت و حیثیت حاصل ہے جس پر مجتبیٰ نے سیکڑوں میل سفر کیا۔ اس اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر بڑی بڑی ہستیوں نے سفر کیا جن میں صادقین، ایم ایف حسین، مشہور غزل سنگر غلام علی کے علاوہ کئی آئی اے ایس آفیسرز، وزراء اور عہدہ دار شامل ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس اسکوٹر کو میوزیم میں رکھنا چاہئے جس کی وجہ سے ایک عظیم فنکار نے نہ صرف ترقی کی منزلیں طے کیں بلکہ کئی عظیم فنکاروں کو منزل مقصود تک پہنچایا۔

مجتبیٰ حسین دوستوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ دوستی اور وضع داری نبھانا انہیں خوب آتا ہے۔ دلی کی گہما گہمی میں وہ کبھی حیدرآبادی دوستوں کو نہیں بھولے۔ دلی میں مزاحیہ مشاعرے کروائے۔ حیدرآباد سے شاعروں کو بلوایا۔ ہندوستان بھر میں محفلیں اور مشاعرے کروائے۔

یہاں کے فنکاروں کو ہندوستان بھر سے متعارف کروایا۔ ان پر نقادوں سے لکھوایا۔ ایسے نقادوں سے بھی مزاح کو تسلیم کروایا جو مزاح کو دوسرے درجے کا ادب سمجھتے تھے۔ دوستوں کے بلاوے پر ٹرین کا تکلیف دہ سفر کر کے حیدرآباد جاتے ہیں۔ آتے ہی سب کو فون کرتے ہیں۔ منٹوں میں سارے شہر میں خبر پھیل جاتی ہے کہ مجتبیٰ آ گئے۔ اسکوٹر کے بعد اب فون ہی وہ واحد ذریعہ رہ گیا ہے جس سے وہ تعلقات نباہنے کا کام لے رہے ہیں۔ اس فون کو بھی محفوظ کر دینا چاہئے۔

وحید اختر نے سچ لکھا تھا:

'جو خصوصیت انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی حیدرآبادیت ہے، ہر اچھا ادب آفاقی ہوتے ہوئے مقامی ہوتا ہے۔ مقامیت اس کی ہمہ گیر اپیل کو کم نہیں کرتی بلکہ دیدگاہ کا کام کرتی ہے۔ (مابعد جدیدیت بھی یہی

کہتی ہے۔)'

آگے چل کر وحید اختر نے لکھا:

'مجتبیٰ کی دیدگاہ حیدرآباد ہے اور ان کی تحریریں حیدرآبادی تہذیب، زبان اور لہجے کی سیر بین ہیں۔'

حیدرآبادی مروت انہیں تکلیفیں جھیلنے پر مجبور کرتی ہے۔ دوستوں کے پیچھے مجتبیٰ نے اپنی ساری زندگی لگادی، خود انہوں نے لکھا تھا:

'جہاں تک میری گھریلو زندگی کا تعلق ہے، میں علی الصباح اپنے گھر واپس ہوتا ہوں اور علی الصباح گھر سے نکل جاتا ہوں۔ سنا ہے میری بھی کوئی گھریلو زندگی ہے۔ اس گھریلو زندگی میں میرے اہل وعیال ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ میں اہل وعیال کا اہل نہیں ہوں۔'

اس کے باوجود اہل وعیال نے انہیں بے پناہ محبت دی۔ اب سب اپنے گھر کے ہو گئے تو اب جا کے مجتبیٰ حسین کو فرصت نصیب ہوئی۔ اب کا زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزرتا ہے۔ وجہ چاہے جو بھی ہو۔

مجتبیٰ حسین نے کبھی اپنے فرائض سے غفلت نہیں برتی۔ جہاں بھی ملازمت کی دوسروں سے بڑھ کر کام کیا۔ ان کی منجھلی بیٹی ذکیہ کا انتقال ہوا تو تدفین کے فوری بعد انہوں نے مزاحیہ کالم لکھا۔ 'سیاست' نے ان کے ہاتھ میں چھوٹا سا تیشہ دیا تھا۔ انہوں نے اس تیشہ سے کتنی ہی نہریں نکالیں۔ وہ اس تیشے کو کبھی نہیں بھولے۔ ان کے مزاج کی یہی احسان مندی انہیں ایک اچھا انسان ثابت کرتی ہے۔ مجتبیٰ حسین کا قد آسمان کو چھونے لگا لیکن پیر ہمیشہ زمین پر ہی رہے۔ وہ تعلقات نبانے کا فن جانتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ باقر مہدی تک سے انہوں نے تعلقات برقرار رکھے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کسی سے ناراض بھی ہوئے تو اسے نقصان نہیں پہنچایا اور اوچھی حرکتیں نہیں کیں۔ مجتبیٰ حسین نے دوستی ہمیشہ برابر کے درجے پر کی۔ نہ کبھی مرعوب ہوئے اور نہ کسی کو مرعوب کیا۔ البتہ ایک معیار قائم رکھا۔ انہوں نے اپنی دوستی کا خاص معیار بنا رکھا ہے اور یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ مجتبیٰ حسین کبھی آسائشوں کے پیچھے نہیں بھاگے۔ حیدرآبادی بے نیازی کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔

مجتبیٰ حسین نے اپنے کالم میں لکھا کہ مزاح نگار سورج مکھی کے پھول کی طرح ہوتا ہے جسے مجبوراً چہرہ روشنی کی طرف رکھنا پڑتا ہے لیکن سورج مکھی کا پھول اسی وقت سورج سے آنکھیں ملا سکتا ہے جب اس میں اتنی توانائی ہو۔ مجتبیٰ حسین کے پاس وہ توانائی ہے۔ انہوں نے اندھیروں کی جانب منھ پھیر کر ہر نئے سورج کا استقبال کیا ہے۔ پہلی محبت کی ناکامی کا غم اٹھایا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے فسادیوں کے ہاتھوں حقیقی ماموں کو قتل ہوتے دیکھا۔ اپنے بھائی سے بچھڑ گئے۔ ان کا آخری دیدار تک نہ کر سکے۔ شاذ تمکنت، عوض سعید، عزیز قیسی، سلیمان اریب سب نے منھ موڑ لیا۔ اب وہ غم یعقوب سے گزر رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کا خیال ہے:

'سچا مزاح وہی ہے جس کی حدیں سچے غم کی حدوں سے شروع ہوتی ہیں۔ زندگی کی ساری تلخیوں اور اس کی تیزابیت کو اپنے اندر جذب کر لینے کے بعد جو آدمی قہقہے کی طرف جست کرتا ہے وہی سچا اور باشعور قہقہہ لگا سکتا ہے۔'

ہر غم نے انہیں نیا حوصلہ دیا ہے۔ وہ بددل کبھی نہیں ہوئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ لالی چودھری کے افسانوں کا مجموعہ اتنے جتن سے کبھی نہ چھپواتے۔

آدمی ترقی کے بہت زیادہ زینے تیزی سے چڑھتا ہے اور انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے گھٹنوں میں تکلیف ہونے لگتی ہے۔ کم از کم ایسی دو مثالیں ہیں۔ ایک مجتبیٰ حسین کی دوسری باجپئی جی کی۔ دونوں نے آپریشن کروائے۔ باجپئی جی کا آپریشن کامیاب رہا۔ مجتبیٰ حسین کا شاید پوری طرح کامیاب نہیں ہوا لیکن شاید یہ اچھا ہی ہوا۔ اپنے ہاتھ میں چھڑی لے کر مجتبیٰ حسین آج بھی بلندیاں طے کر رہے ہیں۔ اگر آپریشن کامیاب ہو جاتا اور ان کی چال باجپئی جی جیسی ہو جاتی تو مزاح کا کتنا نقصان ہوتا۔ ویسے بھی دراز قد آدمی کے سر سے زیادہ اس کے گھٹنوں کی اہمیت ہوتی ہے۔

کسی بھی کتاب کی رسم اجراء ہو مجتبیٰ حسین کے خاکے کے بغیر ادھوری کہلاتی ہے۔ ہر ادیب و شاعر کے دل میں یہ خواہش چھپی ہوتی ہے کہ مجتبیٰ حسین اس پر خاکہ لکھیں۔ اب مجتبیٰ حسین نے نئی ترکیب نکالی ہے جن پر پہلے ہی خاکہ لکھ چکے ہوں اور کتاب بعد میں مرتب ہو تو وہ خاکے کے بجائے کھلا خط لکھنے لگے ہیں۔ لوگ مجتبیٰ حسین کے قلم سے اپنا نام لکھا دیکھنا چاہتے ہیں چاہے انہوں نے استہزائیہ انداز ہی میں تذکرہ کیوں نہ کیا ہو۔ میرے دل میں بھی ایسا خیال آتا ہے۔ دو خواہشیں ابھرتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ عزیز آرٹسٹ میرا پورٹریٹ بنائیں۔ دوسرے مجتبیٰ حسین کبھی مجھ پر خاکہ لکھیں۔ لیکن میں ہزاروں خواہشیں ایسی والا مصرعہ پڑھ کر رہ جاتا۔ خدا کی کرنی ایسی ہوئی کہ عزیز آرٹسٹ نے میرا پورٹریٹ بنا دیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ سلیمان اریب کے بعد انہوں نے اگر کسی ادیب کا پورٹریٹ بنایا ہے تو وہ میرا ہے۔ اتفاق سے مجھے مجتبیٰ حسین کے خاکوں میں جو خاکہ سب سے زیادہ پسند ہے وہ سلیمان اریب کا ہے۔ میں مجتبیٰ حسین کے اس خاکے کو 'دوزخی' سے بڑا خاکہ سمجھتا ہوں۔ اگر مجتبیٰ حسین مجھ پر خاکہ لکھنے کا وعدہ کر لیں تو میں مرنے کے لئے تیار ہوں۔

❑❑❑

ندیم دوست

صبیحہ انور

نامی پریس بلڈنگ
نخاس، لکھنؤ
رابطہ: 9839132270

مشتاق احمد یوسفی نے ایک جگہ لکھا ہے:

'عمل مزاح اپنے لہو کی آگ میں تپ کر نکھرنے کا نام ہے، لکڑی جل کر کوئلہ بن جاتی ہے اور کوئلہ راکھ لیکن کوئلے کے اندر کی آگ باہر کی آگ سے تیز ہو تو وہ پھر راکھ نہیں بنتا، ہیرا بن جاتا ہے۔'

مزاح نگار وہ جیالا ہے جو زندگی کی سفاکیوں پر ہنسنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ حالات کی ناہمواریوں اور اپنی چاک دامنی پر ہنسنے کی ہمت جمع کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ غالبؔ کو حیوان ناطق اور حیوان ظریف کی درجہ بندی سے الگ کر کے دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ستائش اور صلے کی تمنا دامن سے جھاڑ کر زندہ رہنا بھی فن ہے۔ شیکسپیئر ہوں یا سعدی، سودا ہوں یا غالب یا برنارڈ شا زمانے سے اسی لئے کسی کی نہ بنی۔

'ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔'

یہ صرف خط میں لکھا گیا ایک مختصر سا جملہ نہیں، زندگی کر برتنے اور سماجی معاشی ناہمواریوں سے دوستی کر لینے کی ایک داستان بھی ہے۔ اپنا مذاق آپ اڑانا اور آنسو اپنی آستین میں جذب کرنے کا ہنر ہر ایک کے نصیب میں کہاں۔ جہاں تک مزاح نگاری سے دلچسپی اور مزاح نگاری کے احترام کا تعلق ہے، یہ میرے خمیر میں شامل ہے۔ ایک مزاح نگار اور غالب کے پرستار کی بیٹی ہونے کے ناطے مزاح اور زندگی کے کڑوے کوس کو ہنس کر گزارنے کا حوصلہ میں نے اپنے والد میں ہمیشہ دیکھا اور سیکھا۔ ہوائے ظلم سر سر چلتی رہی مگر انہوں نے اپنی کلاہ اسی بانکپن سے کج رکھی اور یہ یقین دل میں مستحکم کیا کہ یہ ہمت اور مشکلوں میں مسکرانا صرف کشادہ دلوں کے نصیب میں ہی ممکن ہے۔

مجتبیٰ حسین صاحب سے میرے والد کے کافی پرانے تعلقات رہے اور ان کی تحریریں اور طرزِ بیان کا تذکرہ والد صاحب بہت خوش ہو کر کرتے تھے۔ مجتبیٰ حسین کے لہجے کی سادگی اور انکساری ان کو اردو مزاح نگاروں میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ میرے والد ان کی اسی خوبی کے معترف تھے۔ مجتبیٰ صاحب سے ان کے خط و کتابت کے روابط ہمیشہ رہے۔ یوں تو اپنے ہم عصر تمام مزاح نگاروں سے دوستانہ رشتے تھے۔ رشید احمد صدیقی، کنہیالال کپور، غلام احمد فرقت، احمد جمال پاشا، رضا نقوی واہی، یوسف ناظم، دلیپ سنگھ اور بھارت چند کھنہ وغیرہ کے نام ذہن میں اس لئے موجود ہیں کہ والد صاحب سے ان کی باقاعدہ خط و کتابت تھی۔ غلام احمد فرقت اور

احمد جمال پاشا کے خطوط بطور خاص بہت دلچسپی سے پڑھتے اور اکثر بآواز بلند ہم سب کو سناتے تھے۔ میرے والد وجاہت علی سندیلوی جنہیں میں میاں جان اور محبت اور بے تکلفی سے میاں کہتی تھی۔ ان خطوط کو بہت لطف لے کر پڑھتے۔ (افسوس کہ اب گھروں میں ڈاک کا آنا، اس کی اہمیت اور گھر والوں کا خط کے ذریعہ سب کے حال چال سے واقف ہونے کا باب آج ہماری روز مرہ کی زندگی کی کتاب سے غائب ہو چکا ہے۔)

میاں جان کی خطوط کی فائل میں مجتبیٰ حسین صاحب کے بہت سے خط موجود ہیں۔ مخصوص رائٹنگ میں، نہایت مؤدب طرزِ تخاطب مگر مزاح کی بجلیاں اندھیرے بادلوں سے جابجا چمکتی ہوئیں۔ سندیلے آنے کا وعدہ اور پروگرام ہر خط میں ملتا ہے۔ مجتبیٰ صاحب سے میں پہلی بار میاں جان کے ساتھ دلی میں ملی تھی۔ منظور الامین صاحبہ کے گھر پر دوپہر کے کھانے پر۔ مجتبیٰ صاحب اسی زمانے میں جاپان کے سفر سے واپس آئے تھے۔ اپنا سفرنامہ 'جاپان چلو' مجھے وہیں عنایت فرمایا تھا۔ جاپان کی تیز رفتاری پر ششدر رہ جانے والے، سیدھے سادے ہندوستانی کا ردِّعمل جس میں تحیر کی جھلکیاں، مسکراہٹ کو قہقہوں میں تبدیل کر رہی ہیں۔ بہت دلچسپ سفرنامہ ہے۔ مزاحیہ سفرنامے اردو میں ابن انشا کے علاوہ بہت کم ہی نظر آتے ہیں۔ انبساط کی لہریں قدم قدم پر راستہ روک کر دوبارہ پڑھنے پر مجبور کرتی ہیں۔

اس کے بعد لکھنؤ میں بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ والد صاحب کے ہمراہ ایک بار وہ میرے گھر پر بھی تشریف لائے۔ اس ملاقات کی تصویریں بھی ہیں۔ ادھر بہت عرصے سے مجتبیٰ صاحب سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ بس ان کی تحریر میں اشتیاق سے پڑھتی رہتی ہوں۔ آج کل ان کی تحریری سرگرمیوں میں کمی آ گئی ہے ورنہ جس تواتر اور دلچسپی سے وہ لکھتے رہے ہیں، باعث رشک ہے۔ اپنے والدین کے ملنے والوں اور وہ لوگ جو والدین کو عزیز رہے ہوں، ان سے ملنا اور پرانے رشتے برقرار رکھنا میں ضروری سمجھتی ہوں مگر میری قدردانی ایک قاری کی حدود میں جس طرح سمٹ گئی ہے، مجھے اس کا ملال ہے۔ والد صاحب کے انتقال پر مجتبیٰ صاحب کے خطوط آئے اور انہوں نے ایک خاکہ بھی لکھا جو والد صاحب اور ان کے تعلقات کی قربت کا حوالہ ہے۔

> ذکر تو مجتبیٰ حسین کا مقصود تھا۔ ان مجتبیٰ حسین کا جو ہمارے زمانے کے صف اول کے مزاح نگار ہیں۔ حیدرآباد دکن کی مٹی ہیں، دلی میں پائے جاتے ہیں۔ اصل میں وہ ان پچھلی دہائیوں میں ابھرے اور نامور ہوئے ہیں۔ جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کتابوں اور رسالوں کا تبادلہ یکسر موقوف تھا۔ مگر اتنا ہے کہ اب چونکہ ادیبوں کا تبادلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے تو ان کے واسطے سے کتابیں اور رسالے بھی کسی نہ کسی صورت ادھر کے ادھر پہنچنے لگے ہیں اور ادھر سے ادھر آنے لگے ہیں۔ سو مجتبیٰ حسین کا مزاح ادھر اب جا کر پہنچنا شروع ہوا ہے اور اب وہ یہاں کے قارئین پر اپنا جادو چلا رہا ہے۔ ہندوستان میں تو کالم نگاری نے وہ فروغ ہی نہیں پایا کہ مزاحیہ ادب کے لئے خطرہ بن جاتی اور کالم نگار مزاح نگاروں کے لئے چیلنج بنتے۔ مجتبیٰ حسین تعجب نہ کریں، شکر کریں کہ ان کے یہاں مزاحیہ ادب کی سرحدیں محفوظ ہیں اور وہ کالم نگاروں کے خوف اور خطرے سے آزاد اپنی مزاح نگاری میں مصروف اور مگن ہیں۔
>
> **(انتظار حسین)**

'جب بھی ملے محبتیں اور شفقتیں نچھاور کرتے ملے۔ محبتوں اور شفقتوں کا اتنا بھاری ذخیرہ ان کے پاس جانے کہاں سے آ گیا تھا کہ کبھی ختم ہونے میں نہ آتا۔ عبدالحلیم شرر کے گزشتہ لکھنؤ کی اگر کوئی جیتی جاگتی تصویر ہو سکتی تھی تو وہ ہمارے وجاہت بھائی تھے۔ ان کے مزاج کی نفاست، سلیقہ مندی، شائستگی اور رکھ رکھاؤ کو جب میں دیکھتا تو محسوس ہوتا جیسے پرانا لکھنؤ ان کی ذات میں مجسم ہو چکا ہے۔ اب ایسے انسان کہاں دیکھنے کو ملیں گے۔'

مجھے یاد ہے کہ تیس پینتیس سال پہلے میرے ایک مضمون پر انہوں نے ہمت افزائیوں سے بھرا ایک خط لکھا تھا۔ وجاہت صاحب کا شمار سینئر لکھنے والوں میں ہوتا تھا۔ جس کھلے دل سے انہوں نے میرے مضمون کی تعریف کی تھی، اسے پا کر میں سٹپٹا گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک سینئر لکھنے والا ایک مبتدی کی اس طرح تعریف کرے گا اور حوصلہ بڑھائے گا۔ میں نے انہیں جواباً لکھا کہ آپ نے اس ناچیز کی جتنی ہمت افزائی کی ہے اور جس طرح کی ہے اسے برداشت کرنے کی یہ خاکسار اپنے اندر ہمت نہیں پاتا ہے۔

'میں بطور خاص ان کی مزاح نگاری کا قائل اور قتیل تھا۔ زندگی کے چھوٹے موٹے موضوعات کو وہ اپنے شگفتہ اور شستہ انداز میں کچھ اس طرح سے پیش کرتے کہ لطف اور انبساط کی ایک دلکش فضا پیدا کر دیتے۔ وہ لفظوں کے مزاح داں تھے اور لفظ کو اپنی تحریر میں اس طرح برتتے تھے کہ لفظ کے معنی چمک اٹھتے۔ رواں دواں سلیس اور بامحاورہ زبان لکھنے پر انہیں بے پناہ قدرت حاصل تھی۔'

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کا محرک اور مدعا ہنسنا اور ہنسانا ہے۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ ہنسی کو ایک مقدس فریضہ گردانتے ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سادگی کے پیچھے معنی کا ایک جہان آباد ہے جو اتنا سادہ بھی نہیں۔ ان کے کرداروں کا بیان زندگی اور سماج کا رویہ ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ کرداروں کے حوالے سے ہمارے عہد اور معاشرے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مجتبیٰ حسین اپنی تحریروں میں کہیں طنز کے نشتر نہیں چلاتے اور نہ ہی مضحکہ اڑاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں طنز اور مضحکہ جو کبھی بھی آگے بڑھ کر پھکڑ پن میں تبدیل ہو جاتا ہے، کبھی کہیں نظر نہیں آیا۔ ایک معصوم سی شائستگی

ہے جو مسکراتی ہے اور مسکرانے کی دعوت دیتی ہے۔

'لوگ پیٹ کے لئے روتے ہیں اور میں پیٹ کے لئے ہنسنے لگا اور اب تک ہنستا جارہا ہوں۔'

'جب مجھے پتہ چلا کہ ساری زندگی یوں ہی روتے روتے گزرنے والی ہے تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ اسے ہنستے ہنستے گزار دیا جائے۔'

'اپنی چھوٹی سی زندگی کا نصف حصہ ہاسٹلوں میں گزار چکا ہوں اس لئے اب اپنے گھر کو بھی ہاسٹل کی طرح استعمال کرتا ہوں اور بیوی کو وارڈن سمجھتا ہوں۔ رات دیر گئے اس لئے واپس آتا ہوں کہ ہاسٹل میں میری زندگی کا یہی معمول تھا۔'

'میں ہنسنے کو ایک مقدس فریضہ سمجھتا ہوں اور قہقہہ لگانے کو دنیا کا سب سے بڑا ایڈونچر۔ سائنس کی ترقی نے انسان کی شخصی مہماتی زندگی کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ امریکہ کو کولمبس نے دریافت کرلیا۔ ماؤنٹ ایورسٹ کو شیر پاتن سنگھ نے فتح کرلیا۔ سائنس دانوں نے چاند پر کمندیں پھینک دیں۔ اب عام آدم کے پاس ایڈونچر یک لئے بچا ہی کیا ہے۔ لے دے کر وہ صرف قہقہہ ہی لگا سکتا ہے اور جب کوئی شخص کھل کر قہقہہ لگاتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس نے امریکہ کو دوبارہ فتح کرلیا ہو یا اس نے ماؤنٹ ایورسٹ کو پھر سے سر کر لیا ہو۔'

'زندگی کے بے پناہ غموں میں گھرے رہنے کے باوجود انسان کا قہقہہ لگانا ایسا ہی ہے جیسے وسیع سمندر میں بھٹکے ہوئے جہاز کو اچانک کوئی جزیرہ مل جائے۔'

'غالب کی شاعری کو اس لئے پسند کرتا ہوں کہ آدمی غالب کی شاعری پسند کرنے پر مجبور ہے۔'

مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں شخصی خاکے اکثر ملتے ہیں مگر یہ خاکے اور تحریریں اس شخص تک محدود نہ رہ کر گرد و پیش کی تصویریں ہیں۔ سب سے اہم اور خاص بات یہ ہے کہ سب کچھ بیان کرتے ہیں۔ مشاہدے اور جزئیات کا سہارا لے کر وہ ایک مکمل اور جامع تصویر بناتے ہیں مگر خود ایک گوشے میں کہیں معصومیت کے ساتھ چہرے پر استعجاب لئے بیٹھے نظر آتے ہیں۔ حالات سے وابستگی کا یہ عالم ہے کہ ایک مزاح نگار کی لبرٹی بھی لیتے ہیں اور حالات حاضرہ اور اکثر سیاسی حالات پر بھی خامہ فرسائی کرتے ہیں جو اردو مزاح نگاری میں نظر نہیں آتی یا بہت کم۔ کسی نے مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک نیا نکتہ اٹھایا ہے کہ مجتبیٰ حسین نے خواتین کے خاکے نہ کے برابر لکھے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ تو مجتبیٰ صاحب جانیں مگر اس کی وضاحت کردیں تو بہتر ہوگا۔

مجتبیٰ حسین اردو کے بہترین مزاح نگاروں کی صف میں ایک نمایاں مقام کے مالک ہیں۔ اعلیٰ درجے کا مزاح خود مزاح نگار کے اندرون سے نمو پاتا ہے۔ زندگی اور اپنے اردگرد سے اس کا لگاؤ، فطرت انسانی کی رمز شناسی، دردمندی ور اس کی حوصلہ مندی ہی اس کو مسکرانے پر مجبور کرتی ہے۔

مجتبیٰ حسین کی تحریریں میرے لئے صرف اس وجہ سے پرکشش اور دلچسپ نہیں ہوتیں کہ وہ مزاح کا بہترین نمونہ ہوتی ہیں، ہنسنے اور کچھ سوچنے کے مواقع فراہم کرتی ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ وہ میرے والد کے قریبی دوست اور ایک قدردان کی تحریر ہوتی ہے۔ غالبؔ نے کہا تھا:

'ندیم دوست سے ہوئے ندیم آتی ہے'

❑❑❑

خاکے لکھنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ خدا جانے انہوں نے کتنے خاکے لکھ ڈالے ہوں گے اور کچھ لوگ اگر بچ بھی نکلے ہیں تو برس دو برس میں ان کے بھی خاکے لکھ ماریں گے اور ایک دن ایسا بھی جلد ہی آئے گا جب گلی گلی، کوچے کوچے میں ان کے فرستادہ آوازیں لگاتے پھریں گے: 'ہے کوئی خاکہ لکھوانے والا!'

خاکہ لکھنے اور خاک اڑانے میں بہت ہی لطیف سا فرق ہوتا ہے۔ اگر احتیاط نہ برتی جائے تو نتائج برعکس برآمد ہوتے ہیں مگر یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ جہاں کسی کو کچھ بھی نظر نہیں آتا، یہ وہاں کیا کیا نہیں دیکھ لیتے۔ اب میری ہی بات دیکھ لیجئے۔ ایک رات ۲ بجے میں کہیں ان کے ساتھ چلا گیا۔ ہمیں ایک عمارت میں ساتویں منزل پر جانا تھا لیکن اتفاق سے اس روز بجلی بند تھی۔ مجتبیٰ حسین کہنے لگے کہ بیدی صاحب آپ کے لئے ساتویں منزل تک پیدل جانا تکلیف دہ تو نہیں ہوگا۔ میں نے کہا کہ ایسی کیا بات ہے۔ چنانچہ ہم دونوں سیڑھیوں پر چڑھنے لگتے ہیں۔ کہیں میں ان سے دو چار قدم بڑھ گیا ہوگا اور غلطی سے ساتویں کے بجائے آٹھویں منزل پر پہنچ گیا ہوں گا۔ بس اس بات کا انہوں نے بتنگڑ بنا لیا اور میرے خاکے میں لکھ مارا کہ میں ابھی جوان ہی نہیں نوجوان ہوں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ لکھ مارا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے پاس ہندوستان کے مختلف شہروں سے ان گنت خطوط آنے لگے کہ میں کیا کھاتا ہوں، کیا پیتا ہوں اور صحت کو قائم رکھنے کے لئے اور کیا کیا حربے استعمال کرتا ہوں بلکہ ایک دواخانے نے تو اپنے تازہ ترین معجون شباب آور کی بوتل کے لیبل پر مجھ سے میری تصویر چھاپنے کی اجازت چاہی۔ اس سے ہماری کچھ مشتہری تو ہوئی لیکن ایسا بھی ہوا کہ چند خوش جمال جو پہلے ہم کو بے ضرر سمجھتے تھے ہم سے کترا کے نکلنے لگے۔ کچھ پردہ نشیں مائل بہ کرم بھی نظر آئے لیکن اس میں میں بے خطا تھا۔ قصوروار دراصل مجتبیٰ حسین تھے۔

آپ نے اکثر دلی کے طبیبوں کو دیکھا ہوگا جو سوائے نبض دیکھنے کے مریض کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے لیکن ان کے پہلو میں ایک نسخہ نویس بیٹھا رہتا ہے جو ہمہ وقت خاموش رہتا ہے لیکن حکیم صاحب کی تشخیص سے پہلے ہی خود نسخہ لکھ کر مریض کے خالی ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ میں جب مجتبیٰ حسین کو اپنے پاس بیٹھا دیکھتا ہوں تو مجھے دہلی کے نسخہ نویس یاد آتے ہیں۔

(کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ)

مجتبیٰ حسین
کے ساتھ ایک شام

معصوم مرادآبادی

Z-103
تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی
رابطہ: 9810780563

صبح بنارس اور شام اودھ کے قصے کس نے نہیں سنے۔لیکن صبح وشام کی رعنائیوں کا تجربہ رکھنے والوں کا اب یہی کہنا ہے کہ نہ تو بنارس کی صبح میں وہ تازگی باقی رہی اور نہ ہی شام اودھ کی رونقیں زندہ ہیں۔اگر آپ اپنی کسی صبح یا شام کو بارونق اور رنگین بنانا چاہیں تو اس کے لئے کسی شہر یا خطے کی قید نہیں بشرطیکہ آپ کو باذوق احباب میسر آجائیں۔

گزشتہ دنوں (11 ستمبر 2005) دہلی میں ایسی ہی ایک شام برپا ہوئی جس کا عنوان تھے ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین۔اس تقریب میں بقول شخصے دہلی کی کریم اور خود مجتبیٰ حسین کے بقول ''آئس کریم'' جمع تھی۔ مجتبیٰ حسین ہمارے عہد کے ایک منفرد مزاح نگار ہیں۔وہ نہ صرف اپنی تحریروں میں ہنستے مسکراتے نظر آتے ہیں بلکہ نجی گفتگو میں بھی ایسے شگوفے چھوڑتے ہیں کہ آپ لوٹ پوٹ ہوجائیں۔مجتبیٰ حسین کی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ کسی ادبی گروہ کے اسیر نہیں ہیں۔اسی لئے ان کے ساتھ شام منانے کے لئے تمام مکاتب فکر کے ادیب وشاعر جمع ہوئے تھے اور اس شام کو لوگوں نے یوں تمام کیا کہ اس کی یادیں دیر تک اور دور تک تازہ رہیں گی اور یہ تمنا بھی باقی رہے گی کہ کاش ہر شام یوں ہی بارونق گزرے۔مجتبیٰ حسین کے تعلق سے اب یہ تنازعہ اٹھ کھڑا ہے کہ وہ اصلاً دہلی کے ہیں یا حیدرآباد کے۔دہلی والوں نے ان پر ملکیت کا دعویٰ کیا ہے جب کہ حیدرآبادیوں کے لئے وہ 'پرسوں' سے اپنے ٹھہرتے۔یہ بات علاحدہ ہے کہ ان کی پیدائش نہ دہلی میں ہوئی اور نہ حیدرآباد میں بلکہ انہوں نے اس دنیائے رنگ وبو میں جب آنکھ کھولی تو خود کو کرناٹک کے شہر گلبرگہ میں پایا۔وہی گلبرگہ جو خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ کی سرزمین ہے۔مجتبیٰ حسین کے اعزاز میں منعقد جلسہ کے مہمان خصوصی خواجہ حسن ثانی نظامی نے یہ کہہ کر سب کو خاموش کردیا کہ خود خواجہ بندہ نواز نے اپنی عمر کے 85 برس دہلی میں گزارے اور 105 برس کی عمر میں انتقال کیا اور اتنی ہی تصنیفات یادگار چھوڑیں۔خواجہ حسن ثانی نظامی نے ایک مقرر کے اس الزام کو بھی یکسر مسترد کردیا کہ مجتبیٰ حسین کا لب ولہجہ حیدرآبادی ہے۔انہوں نے کہا کہ مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں جو سادگی اور پُرکاری ہے، وہ دلّی کا خاصہ ہے اور وہ دہلی اسکول ہی کی نمائندگی کرتے ہیں لہٰذا ان پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کرتا ہوں۔کاش کہ ہمیں کوئی ایسا اختیار مل جائے کہ ہم ان کا حیدرآباد آنا جانا بند کردیں اور اگر کسی نے میرے اس دعوے کو چیلنج کیا تو اس کے لئے میں ایک PIL داخل کرکے ان پر اپنا حق ثابت کرسکتا ہوں۔''

اس تقریب میں مجتبیٰ حسین کے دیرینہ دوست اور دوردرشن کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل شرددت نے تو یہ قصہ سنا کر سب کو لوٹ پوٹ کر دیا کہ ان دونوں کے ایک مشترکہ دوست محمود مرزا جب ایک بار لندن سے آکر شرددت کے مہمان ہوئے تو ان کی خواب گاہ سے رات بھر قہقہوں کی آوازیں بلند ہوتی رہیں جن کی وجہ سے خود شرددت بھی رات بھر سو نہیں سکے۔ صبح کو جب انہوں نے اپنے مہمان سے یہ کہا کہ عموماً جب رات کو لوگ سوتے ہیں تو خواب گاہ سے خراٹوں کی آوازیں آتی ہیں لیکن رات بھر تمہارے کمرے سے قہقہے بلند ہوتے رہے۔ آخر ماجرا کیا ہے؟ محمود مرزا نے جواب دیا کہ دراصل مجھے رات کو نیند نہیں آپاتی اور اس دوران مجتبیٰ حسین کی تحریریں یاد آتی ہیں جنہیں سوچ سوچ کر میں ہنستا رہتا ہوں اور یوں رات تمام ہوجاتی ہے۔'' یہ روئیدا دراصل ایک ایسی خوبصورت شام کی ہے جو دہلی کی بستی حضرت نظام الدین میں ایستادہ غالب اکیڈمی میں آراستہ کی گئی تھی اور اس کا اہتمام دہلی اردو اکادمی نے 'مجتبیٰ حسین کے ساتھ ایک شام' کے عنوان سے کیا تھا۔ حسب عادت ہم اس ادبی جلسے میں بھی یہ سوچ کر تاخیر سے پہنچے تھے کہ عموماً اردو کے جلسوں میں لوگ اپنی گھڑیاں ایک گھنٹہ پیچھے کرکے آتے ہیں۔ اس لئے ہم بھی کیوں انتظار کی بے کیف لذتوں سے آشنا ہوں مگر نہ جانے اس دن دہلی کی ادبی برادری کو کیا ہوا تھا کہ دعوت نامے میں 6 بجے کا وقت درج ہونے کے باوجود لوگوں نے 5 بجے ہی اپنی نشستیں ہتھیالی تھیں اور غالب اکیڈمی میں پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ تقریب کا باضابطہ آغاز ہوچکا تھا اور پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی اپنا ہی لکھا ہوا پڑھنے کی کوشش کررہے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ ''مجتبیٰ حسین کے ظاہری مزاح کے پیچھے بڑی رقت اور بھرائی ہوئی آواز ملتی ہے۔ انہوں نے مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری کے بارے میں کہا کہ وہ اگر جاسوسی ادب کی طرف توجہ کریں تو ان کی تحریریں اچھے جاسوسی ادب میں شامل ہوسکتی ہیں کیونکہ وہ اپنے دوستوں کا تعاقب بڑی باریکی سے کرتے ہیں اور دوستوں کو یہ پتہ بھی نہیں چل پاتا کہ کون سی حرکت مجتبیٰ حسین کے قلمی کیمرے میں قید ہوگئی۔ انہوں نے کہا کہ مجتبیٰ حسین کے خاکوں میں مردم شناسی وافر مقدار میں پائی جاتی ہیں۔''

پروفیسر عتیق اللہ نے مجتبیٰ حسین کی تحریروں کی روشنی میں ایک مرصع مقالہ پیش کیا۔ دوردرشن کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل شرددت نے کہا کہ میں نے آدھی سے زیادہ زندگی مجتبیٰ حسین کے ساتھ گزاری ہے اور مجتبیٰ حسین کی جس خصوصیت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی Integrity اور ان کا Commitment ہے۔ مزاح نگار اسدرضا نے طنز و مزاح کا چار مینار، کے عنوان سے اپنا

غالب اکیڈمی نئی دہلی میں مجتبیٰ حسین کے ساتھ دائیں سے سید شریف الحسن نقوی، پروفیسر شمیم حنفی، مجتبیٰ حسین اور پروفیسر ارتضیٰ کریم

مضمون پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''مجتبیٰ حسین اور چار مینار میں مماثلت یہ ہے کہ دونوں کا تعلق حیدرآباد سے ہے اور دونوں نے ہی حیدرآباد کو مشہور کیا ہے۔ انہوں نے مجتبیٰ حسین کے فن کو اپنے عنوان کی نسبت سے چار زمروں میں تقسیم کرتے ہوئے کالم نگاری، انشاء پردازی، خاکہ نگاری اور سفرنامہ نگاری کو مجتبیٰ حسین کے فن کے چار مینار قرار دیا۔

صدارتی تقریر میں پروفیسر شمیم حنفی نے مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ''کسی محفل کے آخر میں صدارتی خطبہ سے زیادہ سامعین کو صدارتی کتبے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ جب تک صدر کی باری آتی ہے، ان کے قویٰ مضمحل ہوچکے ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجتبیٰ حسین کا المیہ یہ ہے کہ تشدد اور شور شرابے سے بھری دنیا میں وہ اپنی ظرافت کے ذریعہ نالے کو نغمہ بنانے کا جتن کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مزاح نگار دراصل درد اور دہشت کی فضا کے خلاف ایک دفاعی مورچہ ہے۔ مجتبیٰ حسین نے مزاح نگاری کو ایک اخلاقی قدر اور انسانی ذہانت کے سنجیدہ عمل کے طور پر اپنایا ہے۔''

صدارتی تقریر سے ذرا پہلے خود مجتبیٰ حسین نے کہا کہ کسی مزاح نگار کی شام منانا دراصل چوہے کو شراب پلانے کے مترادف ہے۔ شراب اور تعریف کا نشہ زود اثر ہوتا ہے لیکن ایک مزاح نگار کو بشرطیکہ وہ سچا مزاح نگار ہو، مدہوش کرنا ممکن نہیں۔ مزاح نگار زمین سے جڑا رہتا ہے، ہوا میں نہیں اڑتا۔ مزاح نگار سماج کے ان لوگوں کا نشہ اتارتا ہے جو طاقت اور اقتدار کے نشے میں چور ہوکر عام آدمیوں کے لئے مسائل کھڑے کرتے ہیں۔ مزاح نگار اندر سے ایک شریف اور سنجیدہ آدمی ہوتا ہے لیکن وہ بدمعاشوں کو بے نقاب کرنے کے معاملے میں خود بدمعاش بن جاتا ہے۔ اس کی حالت کنول کے اس پھول جیسی ہوتی ہے جو گندگی میں کھلنے کے باوجود خود کو گندگی سے محفوظ رکھتا ہے۔ ایک مزاح نگار کا ظرف ہی اس کی ظرافت کو ناپنے کا واحد پیمانہ ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ دہلی والوں نے میری شام منا کر مجھے بڑے تذبذب سے نکالا کیونکہ ان دنوں میرا زیادہ وقت حیدرآباد اور دہلی کے درمیان حالت سفر میں گزرتا ہے۔ حیدرآبادی مجھے دہلی والا سمجھتے ہیں اور دہلی والے حیدرآبادی گویا کہ میں ایک دوشہرا شہری ہوکر رہ گیا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے دہلی میں اپنی زندگی کا سب سے لمبا عرصہ 33 برس گزارا ہے جو میرے لئے صدیوں کی زندگی جیسا ہے کیونکہ میں گھنٹوں میں نہیں بلکہ لمحوں میں جیتا ہوں۔ میرے نزدیک زندگی دراصل زندہ دلی کا دوسرا نام ہے۔

❑❑❑

مجتبیٰ حسین
اور ہمعصر مزاح نگاروں میں مماثلت

گل رعنا

مکان نمبر 20-7-464
تعلیم ملّاڈ، فتح دروازہ
حیدرآباد
رابطہ: 9849505790

مجتبیٰ حسین نے مزاح نگاری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۶۲ء میں ایک کالم نگار کی حیثیت سے کیا جب اردو میں طنز و مزاح نگاروں کا طوطی بول رہا تھا جن میں فرحت اللہ بیگ، محمد رستم کیانی، محمد خالد اختر، ابن انشاء، کرنل محمد خان، مشتاق احمد یوسفی، صدیق سالک، مجید لاہوری، احمد ندیم قاسمی، فکر تونسوی، یوسف ناظم احمد، جمال پاشا، خواجہ عبد الغفور، بھارت چند کھنہ، وجاہت علی سندیلوی، تخلص بھوپالی، پرویز ید اللہ مہدی، نریندر لوتھری، کنہیا لال کپور اور شفیق الرحمن قابل ذکر ہیں۔ مجتبیٰ حسین کا شمار بھی اسی دور کے ادیبوں میں کیا جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین اور ان کے ہم عصروں کی تحریروں میں کسی حد تک مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے چند ہم عصروں کی تحریروں کا جائزہ لے کر ملتے جلتے موضوعات اور اسلوب کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

فرحت اللہ بیگ اور مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں مماثلت

فرحت اللہ بیگ اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں اہم نام اور مقام کے حاصل ہیں۔ انہوں نے ماضی کی مرقع کشی میں کمال دکھایا ہے۔ گزرا ہوا زمانہ، گزرے ہوئے حالات اور مرحومین کے تذکرے پر لطف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ روزمرہ اور دلی کی مخصوص زبان استعمال کر کے اس لطف کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ 'ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی' ان کی اچھی مثال ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے دلی کو تہذیب و تمدن، وہاں کی روایات، شاہی رکھ رکھاؤ اور آداب و اطوار کو محفوظ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا مضمون 'نئی دہلی' اہمیت کا حامل ہے۔ ایک کردار مرزا چھکڑا کی زبانی پرانی اور نئی دہلی کا فرق وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ قدیم اور جدید تہذیب کا تقابل کرتے ہوئے جدید پر طنز کیا ہے۔ فرحت اللہ بیگ مرزا چھکڑا کی زبانی یوں کہلواتے ہیں:

'دلی تو بہت دن ہوئے جنت کو سدھاری، اب یہ دلی تھوڑی ہے، یہ تو لاہور کی اماں ہے۔ جاؤ جائیداد بیچ کے کہیں اور جا بسو اور یہ دلی تمہاری نہیں رہی۔'

مرزا فرحت اللہ بیگ اور مجتبیٰ حسین دونوں ہی نے دم توڑتی تہذیب پر طنز و مزاح کے پردے میں دو آنسو گرائے ہیں۔ قدیم اور جدید تہذیب کا جو تقابل فرحت اللہ بیگ کے ہاں موجود ہے وہ ہمیں مجتبیٰ حسین کی

تحریروں میں بھی ملے گا۔ فرحت اللہ بیگ نے مرزا چھکڑا کی زبانی دلی کے چاؤڑی (جہاں طوائفوں کے کوٹھے تھے) کا ذکر کرکے نئی اور پرانی دہلی کا فرق واضح کیا ہے۔ درج ذیل اقتباس میں مرزا چھکڑا کے ذریعہ یہ واضح کیا گیا ہے کہ نئی دہلی کی طوائفوں میں وہ خوبصورتی اور تہذیب موجود نہیں ہے جو قدیم دلی کی طوائفوں میں ہوا کرتی تھی۔ ملاحظہ کیجئے:

'دلی کا دل چاؤڑی ہے۔ اب تو چاؤڑی کو دیکھ کیا رنگ ہے جب دل ہی بگڑ گیا تو شہر کیا رہا۔ اب جامع مسجد سے لگا کر اجمیری دروازے تک چلا جا، وہ شکلیں نظر آئیں گی کہ خدا کی پناہ۔ قاضی کے حوض والے کوٹھے کو جا کر دیکھ، پہلوان بیٹھے ہیں۔ تھوبڑا سا منہ، بیل سے دیدے، یہ موٹی ناک، ڈھیلا ڈھالا انچوزوں کا سالباس اور خود بی جان نے جو دم لگایا تو حقہ بھی چیخ اٹھا، منہ اوپر کرکے جو دھواں چھوڑا تو معلوم ہوا کہ قطب کی لاٹھ کمرے میں آکر کھڑی ہوگئی۔ یہ میں نے اس رنڈی کا ذکر کیا ہے جو چاؤڑی کی ناک کہی جاتی ہے۔'

فرحت اللہ بیگ کی طرح مجتبیٰ حسین کے یہاں بھی قدیم اور جدید تہذیب کا تقابل ملتا ہے۔ ساتھ ہی جدید پر طنز اور قدیم تہذیب کے پامال ہوجانے پر پُرتاسف لیکن طنز سے بھرپور کلمات ملتے ہیں۔ وہ اپنے وطن عزیز حیدرآباد اور گلبرگہ کا ذکر بڑی عقیدت مندی، خلوص اور محبت کے ساتھ کرتے ہیں۔ حیدرآبادی تہذیب کی پہچان کے کھوجانے پر رنجیدہ بھی نظر آتے ہیں۔ اس موضوع پر ان کا ایک مضمون 'حیدرآباد کا جو ذکر کیا' کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

'یوں تو کہنے کو حیدرآبادجوں کا توں محفوظ ہے لیکن اس کے باوجود ادھر چند برسوں سے جب بھی ہم حیدرآباد آتے ہیں تو حضرت جگر مرادآبادی کی طرح ہمیں بھی یہاں کی ہر شئے میں کسی شئے کی کمی نظر آتی ہے۔ حیدرآباد وہی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اب ہمیں خود حیدرآباد میں حیدرآباد کی کمی نظر آتی ہے۔ تیرہ برس پہلے شام کو معظم جاہی مارکیٹ پر نکلتے تھے تو ہر چند قدم کے بعد ملنے والا پیچھے سے ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا تھا کہ بھیا! کہاں چلے کیسے ہو؟ کس حال میں ہو؟ اب معظم جاہی مارکیٹ پر نکلتے ہیں تو اتنا ہوتا ہے کہ کوئی رکشا والا اچانک ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھمکا دیتا ہے کہ 'ابے سڑک پر کدھر چلتا ہے۔ فٹ پاتھ پر چل۔''

مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں مماثلت

مشتاق احمد یوسفی اردو کے مایۂ ناز طنز و مزاح نگار ہیں۔ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ انہوں نے روز مرہ کے واقعات، عوام کی معمولی سی عادتوں اور خود اپنی ذات کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ انہوں نے بالکل سادہ سا موضوع لے کر اسے بہترین انداز میں پیش کرکے خاص بنا دیا ہے۔ مثلاً مرغابیاں پالنا، پہاڑی مقامات کی سیر، بیماری اور بیمار کی عیادت، چارپائی، عورتوں کا موٹاپا وغیرہ۔ بظاہر مرغیاں پالنا کوئی ایسا کام نہیں ہے جو بالکل اچھوتا ہو لیکن مشتاق احمد یوسفی نے اس میں مزاح کی چنگاریاں شامل کرکے اسے پرلطف بنا دیا۔ مجتبیٰ حسین نے بھی سادہ موضوعات پر طنزیہ مزاحیہ تبصرے کئے ہیں جیسے قصہ داڑھ کے درد کا، سکنڈ ہینڈ موٹر سیکل، تعزیتی جلسے، ٹرین میں پڑھنا وغیرہ۔

مشتاق احمد یوسفی نے پاکستان کے شہر کراچی کے متعلق خصوصی طور پر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ کراچی کی آب و ہوا اور وہاں کے باشندوں کا بھی دلچسپ تذکرہ کرتے ہیں۔ مضمون 'موسموں کا شہر' بڑا ہی پُر لطف مضمون ہے جس میں کراچی کے موسم کی غیر یقینی کو بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے:

ملاحظہ کیجئے:

ہم نے کراچی کے ایک قدیم باشندے سے پوچھا، یہاں مان سون کا موسم کب آتا ہے؟ اس بزرگ باراں دیدہ نے نیلے آسمان کو تکتے ہوئے جواب دیا کہ چار سال پہلے تو بدھ کو آیا تھا۔

(چراغ تلے، مشتاق احمد یوسفی، ص ۱۶۰)

یوسفی کے یہاں توہمات کا ذکر ضمنی طور پر آتا ہے۔ مضمون 'پڑیئے گر بیمار' میں توہم کا ضمنی ذکر اس طرح ملتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

'مجھے اس بات پر قطعاً تعجب نہیں ہوتا کہ ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگ خونی پیچش کا علاج گنڈے تعویذوں سے کرتے ہیں۔ غصہ اس بات پر آتا ہے کہ وہ واقعی اچھے ہوجاتے ہیں۔'

(چراغ تلے، مشتاق احمد یوسفی، ص ۲۴)

مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں مشابہت پائی جاتی ہے مثلاً دونوں کے موضوعات میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ دونوں مزاح نگار مزاح پیدا کرنے کے لئے عموماً لفظی مناسبتوں، تلازمات، لفظی الٹ پھیر، تشبیہات اور طنز کا استعمال کرتے ہیں۔ دونوں کو زبان پر عبور حاصل ہے کیونکہ جب تک زبان پر عبور حاصل نہ ہو اور الفاظ کو حسب ضرورت استعمال کرنے کا ملکہ حاصل نہ ہو، مزاح نگاری میں کمال حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ دونوں مزاح نگار اس میں کامیاب ہوئے۔ کلاسیکی شعر و ادب پر گہری نظر بھی اس سلسلے میں فائدہ مند ثابت ہوئی۔ دونوں نے سیاست اور مذہب کو موضوع نہیں بنایا۔ مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین دونوں ہی نے اشعار کی تحریف کرکے بھرپور مزاح پیدا کیا۔ دونوں ہی یہ کام اس قدر چابکدستی سے کرتے ہیں کہ اس میں گہرے طنز کے ساتھ لطف پیدا ہوجاتا ہے۔ بے ساختگی، بذلہ سنجی، ذہانت اور حاضر جوابی نے یوسفی اور مجتبیٰ حسین کے

مزاح کو توانائی بخشی ہے۔ دونوں کے مزاح کی ذہنی سطح بہت بلند ہے۔

یوسفی کے مزاح سے بعض اوقات وہ قاری پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے جو ادب کے وسیع پس منظر سے واقف نہ ہوں۔ مجتبیٰ حسین کے یہاں بھی ادب و شعر کا گہرا ذوق نظر آتا ہے لیکن وہ ایک عوامی مزاح نگار ہیں جس کی وجہ سے ان کا مزاح مختلف ذہنی سطحوں کے قاری کے لئے لطف کا باعث بنتا ہے۔

یوسفی اور مجتبیٰ حسین دونوں کے یہاں اپنے وطن اور ان شہروں سے لگاؤ نظر آتا ہے جہاں وہ رہے۔ یوسفی کراچی اور راولپنڈی کا محبت آمیز ذکر کرتے ہیں تو مجتبیٰ حسین گلبرگہ، حیدرآباد اور دلی کا والہانہ تذکرہ کرتے ہیں۔

یوسفی کے یہاں جگہ جگہ مزاح پیدا کرنے کے لئے خود ساختہ مزاحیہ کردار جیسے مرزا و دود بیگ نظر آتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے بھی چند کردار وضع کئے ہیں لیکن ان کے یہ کردار یوسفی کی طرح ہر تحریر میں شامل نہیں رہتے۔ مجتبیٰ حسین کے وضع کردہ ہر کردار کا تعارف صرف ایک مرتبہ ہی ہوا ہے۔ مثال کے طور پر مرزا سے ہماری ملاقات مضمون 'مرزا کی یاد' میں ہوئی ہے۔ علامہ نارسا سے ان کی 'وفات مسرت آیات' پر ہم مل چکے ہیں۔ مرزا دعوت علی بیگ کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔ قاضی غیاث الدین سے مضمون 'لوٹ پیچھے کی طرف' میں ہماری ملاقات ہوئی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے یوسفی کی طرح ایک ہی نام کے کردار کو پیش کرنے سے گریز کیا ہے ورنہ شاید ان پر الزام لگ سکتا تھا کہ وہ یوسفی کی نقل کرتے ہیں۔

ابن انشاء اور مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں مماثلت

ابن انشاء بنیادی طور پر مزاح نگار تھے۔ انہوں نے مزاحیہ کالم نگاری میں کافی نام حاصل کیا۔ ان کے کالموں کا مجموعہ 'خمار گندم' کے نام سے شائع ہوا جس میں کئی ہنگامی موضوعات پر تبصرے ملتے ہیں۔ انہوں نے ناہمواریوں پر ہمیشہ نظر رکھی لیکن ان ناہمواروں پر طنز کے دوران شگفتگی کا دامن ہرگز نہ چھوڑا۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ ان کی تحریروں میں مبالغہ آرائی ملتی ہے۔ مزاح پیدا کرنے کی خاطر اپنی ذات سے متعلق مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے شعوری یا لاشعوری طور پر خود ایک مزاحیہ کردار بنا لیا تھا۔ انشاء نے مشرقی معاشرے کا موازنہ اہل فرنگ سے کرتے ہوئے مشرق کی معاشرتی برائیوں پر ڈھکے چھپے الفاظ میں طنز کیا ہے۔

ابن انشاء اور مجتبیٰ حسین دونوں میں مماثلت کئی طرح سے موجود ہے۔ دونوں کی تحریروں میں انسانیت کا درد ملتا ہے۔ دونوں کے یہاں عوام کے مظلوم طبقات سے ہمدردی کے جذبات نمایاں ہیں۔ مشرق اور مغرب کا فرق کئی مقامات پر ملتا ہے۔ اہل مشرق اور خاص کر مسلمانوں کی حالت زار اور بے راہ روی اور مذہب سے دوری پر دونوں نے بے باکانہ قلم اٹھایا ہے۔ مغرب اور مشرق کا تقابل کرتے ہوئے مشرق کی خامیوں اور کوتاہیوں پر طنز کرتے ہوئے ان کی خامیوں اور کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مجتبیٰ حسین نے 'جاپان چلو جاپان چلو' میں جاپان اور ہندوستان کا تقابل کیا ہے تو ابن انشاء نے 'ابن بطوطہ کے تعاقب میں' جاپان، مصر اور مغربی ممالک کا تقابل پاکستان سے کیا ہے اور مسلمانوں کی حالت زار پر انہوں نے بھی طنز کے پیرائے میں افسوس کا اظہار کیا ہے۔ دونوں کے یہاں اپنے اپنے ملک سے محبت کے علاوہ یہاں کے تمدن اور ماحول کا ذکر اور ان پر پُرلطف تبصرے ملتے ہیں۔ روانی دونوں مزاح نگاروں کی خصوصیت ہے۔ ابن انشاء اور مجتبیٰ حسین دونوں کے یہاں ایک تکنیک مشترک ہے۔ دو تین جملوں کے بعد ایک جملہ بے ساختہ اور برجستہ استعمال کرتے ہیں اور اکثر یہی جملہ پچھلی عبارت میں جان ڈال دیتا ہے۔ سفرنامہ 'ابن بطوطہ کے تعاقب میں' سے ایک حصہ ملاحظہ فرمائیے:

'یہ سچ ہے کہ ہمارے حساب سے اہل فرنگ میں نیکی اور نیک چلنی کا فقدان ہے کیونکہ شراب اکثر پیتے ہیں، گوشت بھی حلال یعنی ذبیحہ کا نہیں کھاتے ہیں، پردے کا بھی چنداں خیال نہیں، دوکانداروں کے ماتھوں پر نماز کے گٹے اور ہاتھوں میں تسبیح بھی نہیں ان کی عاقبت کا معاملہ مشکوک ہے۔ لیکن ملاوٹ کا کاروبار وہاں نہیں ہے۔ دودھ دہی اور مکھن سب کا سب خالص ملتا ہے۔ چائے کی پتی میں بھی پتے کا چھلکا نہیں ہوتا نہ ہلدی میں اینٹیں ہوتی ہیں، چینی دوکانوں سے پلک جھپکتے میں غائب نہیں ہوتی نہ آٹا کہیں جاتا ہے حتیٰ کہ لوگ مین ہولوں کے ڈھکنے تک نہیں چراتے۔'

مجتبیٰ حسین نے بھی مشرق خاص کر ہندوستانیوں کی کمزوریوں، کوتاہیوں اور نااہلی کو اپنا موضوع بنا کر بھرپور طنز کیا۔ سفر جاپان کے دوران بلٹ ٹرین کا ذکر اس کی اچھی مثال ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

'جاپانیوں کو سفر کرنا بالکل نہیں آتا۔ اس معاملے میں یہ ہم سے بہت پیچھے ہیں۔ صرف آرام دہ ریل گاڑیاں بنانے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ سفر کرنے کے کچھ آداب بھی ہوتے ہیں۔ جن سے جاپانی بالکل واقف نہیں ہیں۔ ہمیں جاپانی ریل گاڑیوں سے یہ شکایت رہتی ہے کہ یہ بہت ٹھیک وقت پر چلتی ہیں۔ انتظار میں جو لذت ہوتی ہے اس کا مزہ جاپانیوں کو کیا معلوم ہے۔ ایسے ہی کئی معاملات ہیں جن میں جاپانی ہم سے بہت پیچھے ہیں۔ آپ یقین کریں کہ ہمیں ٹوکیو میں کسی اسٹیشن پر ٹرین کے لئے دو منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس ٹرین جاتی ہے تو دوسری اس کے پیچھے آجاتی ہے اور پھر ان کی رفتار بھی ایسی

تیز کہ آدمی کا کلیجہ منھ کو آجائے۔'

(بلٹ ٹرین میں کبھی نہ بیٹھو، ص ۷۹)

کنہیالال کپور اور مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں مماثلت

کنہیالال کپور اردو کے مایۂ ناز طنز و مزاح نگار گزرے ہیں۔ وہ آزادی سے قبل بھی لکھتے تھے اور آزادی کے بعد بھی لکھتے رہے۔ ان کی پہلی کتاب 'سنگ و خشت' ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے دیباچے میں کنہیالال کپور نے لکھا ہے:

'اردو میں سب سے پہلا مضمون ۱۹۳۸ء میں لکھا تھا 'چینی شاعری' یہ 'ادب لطیف' میں شائع ہوا۔'

(سنگ و خشت، کنہیالال کپور، ص ۷)

دیگر کتابوں میں 'شیشہ و تیشہ' (۱۹۴۴ء)، 'نازک خیالیاں' (۱۹۴۴ء)، 'چنگ و رباب' (۱۹۴۶ء)، 'نوک نشتر' (۱۹۴۹ء)، 'بال و پر' (۱۹۵۲ء)، 'نرم گرم' (۱۹۵۷ء)، 'گردِ کارواں' (۱۹۶۰ء) اور 'دلیل سحر' (۱۹۶۴ء) شامل ہیں۔ کنہیا لال کپور اپنے آپ کو کسی مکتب فکر سے وابستہ نہیں کرتے۔ اس بات کا اظہار انہوں نے ایک جگہ اس طرح کیا ہے:

'میں کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتا، ترقی پسند ہوں نہ رجعت پسند۔ اگر کچھ ہوں تو اعتدال پسند۔'

(دلیل سحر، کنہیالال کپور ص ۶۰)

کنہیالال کپور کے یہاں مزاح کے مقابلے طنز زیادہ ملتا ہے۔ اس کی وجہ آزادی کے بعد برپا ہونے والے فسادات اور قتل و غارت کے واقعات ہو سکتے ہیں۔ آزادی کے بعد کنہیالال کپور نے پاکستان سے ہندوستان ہجرت کی تھی۔ ان کی اکثر تحریروں میں ہجرت سے پیدا ہونے والے مسائل اور آزادی کے بعد پھوٹ پڑنے والے فسادات پر انتہائی شدید انداز میں طنز ملتا ہے۔ اس کے علاوہ پیروڈی کنہیالال کپور کا اہم ہتھیار ہے۔ 'آب حیات' کی پیروڈی انہوں نے اردو ادب کا آخری دور کے نام سے کی جس میں بعض ادبی رجحانات مثلاً تذکرہ نویسی، ترقی پسند ادبی تحریک، حلقہ ارباب ذوق اور بعض شعراء کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

اسی مضمون میں ساحر لدھیانوی کے متعلق لکھتے ہیں:

'طبیعت کا رجحان اشتراکیت کی طرف تھا۔ مطلوبہ کرایہ نہ ہونے کی وجہ سے ماسکو نہ جا سکے۔ عمر بھر مارکس کا فلسفہ جس حد تک اسے سمجھ سکے، نظموں میں قلمبند کرتے رہے۔'

اسی مضمون میں کرشن چندر کے متعلق لکھتے ہیں:

'ساری عمر اس کوشش میں سرگرداں رہے کہ کسی نہ کسی طرح ادب کو گھسیٹ کر پروپیگنڈے کے قریب لے آئیں اور آخر میں اس سعی میں کامیاب ہو گئے۔'

کنہیالال کپور نے دیگر ادبی رجحانات پر بھی نکتہ چینی کی ہے۔ ادب و زبان کے حوالے سے کنہیا لال کپور نے اردو زبان سے اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی اچھی مثال کتاب 'نرم گرم' کا انتساب ہے جو ذیل میں درج ہے:

'اردو زبان کے نام، جو مظلوم ہونے کے باوجود بڑی ظالم ہے۔'

کنہیالال کپور اور مجتبیٰ حسین نے بھی معاشرے کو ہموار بنانے کی خاطر مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کا سہارا لیا ہے۔ دونوں کے یہاں طنز میں شگفتگی کے ساتھ ساتھ تلخی ملتی ہے۔ دونوں میں ایک مماثلت یہ ہے کہ کنہیالال کپور اور مجتبیٰ حسین غم و غصہ پر قابو کا ملکہ رکھتے ہیں۔ دونوں ہی ادیبوں کے طنز و مزاح کا مثبت پہلو یہ ہے کہ ان کے موضوعات حقیقت پسندانہ اور زندگی سے قریب ہیں۔ دونوں نے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل پر ایک نئے زاویئے سے نگاہ ڈالی ہے۔

دونوں کا مشترکہ موضوع ہندوستانیوں کی کاہلی بھی ہے جو ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا بڑا سبب ہے۔ دونوں مزاح نگاروں نے اس پر اپنے اپنے انداز میں بھرپور طنز کیا ہے۔ ذیل میں کنہیالال کپور کے مضمون 'ایک عام ہندوستانی کی ذہنیت و سیرت' سے ایک اقتباس درج ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

'ایک عام ہندوستانی اپنے تمام آلام و مصائب کا ذمہ دار صرف دو چیزوں کو ٹھہراتا ہے یعنی انگریز اور قسمت۔ دو چیزیں اس کے اعصاب پر ہر وقت سوار رہتی ہیں۔ مذہب اور عورت۔ دو چیزوں سے اسے سخت نفرت ہے، صفائی اور پابندئ وقت۔ دو چیزیں اسے از بس پسند ہیں۔ دخل در معقولات اور شور۔'

جیسا کہ کنہیالال کپور نے لکھا ہے کہ اردو زبان مظلوم ہونے کے ساتھ ظالم بھی ہے، اس جملے میں معنوں کا ایک وسیع دفتر موجود ہے۔ اس میں اردو کے ساتھ لگاؤ، محبت، خلوص اور عقیدت ظاہر ہے۔ مجتبیٰ حسین نے بھی کنہیالال کپور کی طرح اردو کی محبت اور اس کے درد کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ وہ اپنے ملک میں ہوں یا کسی دوسرے ملک میں، ہمیشہ ہی اردو زبان کی حالت زار انہیں مایوس رکھتی ہے۔

مجتبیٰ حسین اپنی تحریروں میں اردو کے فروغ کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں۔ 'اردو کی نئی بستیاں' کے عنوان سے یوں رقم طراز ہیں:

'اردو کی پرانی بستیوں میں رہنے والوں سے ہم پھر ایک بار یہ کہنا چاہیں گے کہ وہ صرف اس بات پر خوش ہونے کی کوشش نہ کریں کہ اردو بستیاں آباد ہو رہی ہیں۔ ہو سکے تو اردو کی پرانی بستیوں کے علاوہ نئی بستیوں میں بھی نئی نسل کو اردو تعلیم سے روشناس کرانے کی ضرورت کو محسوس کیا جائے۔'

کنہیا لال کپور کی طرح ہی مجتبیٰ حسین بھی ہندوستانیوں میں موجود برے اوصاف سے رنجیدہ ہیں۔

❑❑❑

مجتبیٰ حسین اور حیدرآباد

محسن خان

مکان نمبر 14-1-497
مقابل گیان باغ
سیتارامپٹ، حیدرآباد
رابطہ: 9397994441

مجتبیٰ حسین دکن کا وہ کوہ نور ہے جس کی قدر ہم (حیدرآبادیوں) نے اُس طرح نہیں کی جیسی کہ کی جانی چاہیے تھی۔ حیدرآباد سے مجتبیٰ حسین اور مجتبیٰ حسین کو حیدرآباد سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح چارمینار ساری دنیا میں حیدرآباد کی پہچان ہے اسی طرح اردو ادب میں مجتبیٰ حسین حیدرآباد کی شان ہیں۔ ساری دنیا میں جب بھی طنز و مزاح کے حوالے سے دکن کی کسی شخصیت کا نام لیا جاتا ہے تو سب سے پہلا نام مجتبیٰ حسین کا ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین دکن کی عظیم تہذیب کے نمائندے ہیں۔ انہوں نے یہاں نہ صرف بادشاہی حکومت کا دور دیکھا بلکہ دوسری جنگ عظیم کے بین الاقوامی سطح پر ہونے والے تباہ کن اثرات کو بھی جھیلا۔ جب ہیروشیما پر پہلا نیوکلیر بم 1945ء میں پھینکا گیا تھا اُس وقت مجتبیٰ حسین کی عمر بمشکل بارہ سال تھی۔ ہندوستان میں ملک کی آزادی کے لیے زبردست جدوجہد جاری تھی۔ بالآخر 1947ء میں ملک آزاد ہوا اور عملی سیاست کی ناعاقبت اندیشیوں کے باعث ملک دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ اسی اثناء میں سابق ریاست حیدرآباد (دکن) میں بڑی مختلف النوع سیاسی تحریکیں چلیں اور 17 ستمبر 1948ء کو حیدرآباد کو پولیس ایکشن کے سانحہ سے گذرنا پڑا۔ سینکڑوں ہزاروں جانیں گئیں۔ اُن دنوں مجتبیٰ حسین جن کی عمر اس وقت چودہ برس کی ہوگی نہایت ہولناک اور بھیانک واقعات کے چشم دید گواہ بھی رہے ہیں۔ وہ اِن دنوں سابق ریاست حیدرآباد کے ضلع گلبرگہ کے میڈل اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ مجتبیٰ حسین نے فسادات میں اپنے ماموں کو قتل ہوتے دیکھا' عثمان آباد میں ان کے آبائی مکان کو لوٹ لیا گیا۔ مجتبیٰ حسین کے والد سابق ریاست حیدرآباد میں گلبرگہ کے تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے۔ انہیں علم و ادب کا بڑا شوق تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول' طلسم ہوش ربا اور الف لیلیٰ کی کہانیوں کے علاوہ غالبؔ' ذوقؔ' سوداؔ اور میر تقی میرؔ کے دواوین بھی اُن کے پاس تھے۔ گویا مجتبیٰ حسین کے خاندان میں علم و ادب سے دلچسپی پہلے سے رہی ہے۔ چنانچہ مجتبیٰ حسین کو اور ان کے دو بڑے بھائیوں محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس کو ادب سے شغف ورثہ میں ملا ہے۔

مجتبیٰ حسین نے بڑے مشکل حالات میں گلبرگہ میں انٹرمیڈیٹ کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ یہاں سے مجتبیٰ حسین نے اپنی زندگی میں جو مایوسی اور اداسی چھائی ہوئی تھی اس سے اپنے آپ کو بالکل الگ کرلیا اور کالج کی ہمہ جہت سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ انہوں نے گلبرگہ کالج میں بہترین اداکار اور ایک اچھے گلوکار

ہونے کے علاوہ علمی وادبی سرگرمیوں میں پرجوش حصہ لینا شروع کیا۔ چنانچہ جب وہ گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج کی بزم اردو کے جنرل سکریٹری تھے تو انہوں نے گلبرگہ میں ایک شاندار کل ہند مشاعرہ منعقد کیا۔ جس کی صدارت جگن ناتھ آزاد نے کی اور جس میں مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی، شاہد صدیقی، سلیمان اریب، عزیز قیسی وغیرہ جیسی شخصیتوں نے شرکت کی۔ گلبرگہ کے ادب کی تاریخ میں اس مشاعرہ کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

انٹرمیڈیٹ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد 1952ء میں بی۔اے کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے وہ حیدرآباد آگئے۔ ان کے تین بڑے بھائی (محبوب حسین جگر، ابراہیم جلیس اور یوسف حسین) حیدرآباد میں پہلے سے مقیم تھے، یہ الگ بات ہے کہ بعد میں ابراہیم جلیس اور یوسف حسین نے پاکستان ہجرت کی۔

اگرچہ مجتبیٰ حسین پہلے بھی حیدرآباد میں بڑے بھائیوں سے ملنے کے لیے آیا کرتے تھے مگر حیدرآباد میں ان کا لمبا قیام نہیں رہتا تھا۔ اس طرح 1952ء سے حیدرآباد میں ان کے لمبے قیام کا عرصہ شروع ہوتا ہے جو کم وبیش دو دہائیوں پر مشتمل ہے۔ گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج کی سرگرمیوں کے مطابق انہوں نے دنیا کی پہلی اردو یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ میں بھی اپنی سرگرمیوں کو آگے بڑھایا اور جامعہ عثمانیہ کی بزم اردو کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے بھاری اکثریت کے ساتھ منتخب کیے گئے۔ یہیں سے حیدرآباد سے اُن کا گہرا تعلق شروع ہوتا ہے۔ بی۔اے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ روزنامہ سیاست سے وابستہ ہوگئے جہاں ان کے بڑے بھائی محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر اور جگر صاحب کے گہرے دوست عابد علی خان بحیثیت ایڈیٹر فائز تھے۔ مجتبیٰ حسین نے 1956ء میں بحیثیت سب ایڈیٹر اپنا ادبی سفر شروع کیا جو پچھلے 65 برسوں سے جاری ہے۔ اسی اخبار میں محض اتفاقاً انہوں نے مزاحیہ کالم نگاری کا آغاز بھی کیا اور آج وہ اردو دنیا کے نہایت ممتاز ترین طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

12 اگست 1962ء کو مجتبیٰ حسین نے مزاح نگاری کا آغاز کیا جسے انہوں نے ایک چیلنج کے طور پر نہ صرف قبول کیا بلکہ اُسے ایک عقیدہ اور نصب العین کے طور پر اپنایا۔ مجتبیٰ حسین نے 1966ء میں حیدرآباد میں اردو کے طنز ومزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس منعقد کی جو اُن کے ذہن کی ایک اختراع تھی۔ اس کانفرنس میں ہندوستان بھر کے 29 مزاح نگاروں نے شرکت کی۔ یہ ایک عہد ساز کانفرنس تھی جسے زندہ دلان حیدرآباد کے بینر تلے منعقد کیا گیا تھا۔ مجتبیٰ حسین اس کے جنرل سکریٹری رہے، پھر اس کے بعد حیدرآباد میں طنز ومزاح کی تقاریب کا چلن عام ہوا۔ یہی نہیں برصغیر ہندو پاک کے مزاح نگاروں کی تقاریب کا ایک سلسلہ سا شروع ہوگیا۔ اس کانفرنس کا افتتاح مشہور شاعر مخدوم محی الدین نے کیا اور صدارت کرشن چندر جیسے اہم افسانہ نگار وطنز نگار نے کی۔ اس کانفرنس کے بعد ہندوستان بھر کے اہم شہروں میں ایسی تقاریب کا ایک سلسلہ سا شروع ہوگیا۔ جن میں مجتبیٰ حسین اور ان کے حیدرآبادی ادیبوں اور فنکاروں کو مدعو کیا جانے لگا اور یہیں سے حیدرآباد کو طنز ومزاح کی راجدھانی بھی کہا جانے لگا۔ 1962ء میں مجتبیٰ حسین نے محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ میں ملازمت اختیار کی مگر وہ روزنامہ سیاست کا مزاحیہ کالم پابندی سے لکھتے رہے۔ انہوں نے کئی نئے مزاح نگاروں کی ہمت افزائی کی اور بعض سنجیدہ لکھنے والوں کو مزاح لکھنے کی طرف مائل کیا۔ مجتبیٰ حسین نے جب اپنی سرگرمیاں شروع کیں تو اس وقت حیدرآباد کا اردو معاشرہ اپنے عروج کو پہنچ گیا تھا۔ مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد، میکش حیدرآبادی، سلیمان اریب، عزیز قیسی، خورشید احمد جامی، مغنی تبسم، شاذ تمکنت، وحید اختر، شاہد صدیقی، ابن احمد تاب، خیرات ندیم، اقبال متین، رحمن جامی، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، آمنہ ابوالحسن، عوض سعید، عاتق شاہ جیسی شخصیتوں کا ہر طرف چرچا تھا۔ اسی عرصہ میں نئی نسل کے کچھ ادیبوں اور شاعروں نے بھی اپنی سرگرمیاں شروع کیں جیسے تاج مہجور، رؤف خلش، اعظم راہی، حسن فرخ، غیاث متین، مسعود عابد، رشید انور، ساجد اعظم، احمد جلیس۔ یہ ایک توانا نسل تھی جو سینئر ادیبوں اور شاعروں کے بعد اُبھر رہی تھی۔ اس وقت کا ادبی ماحول بڑا توانا تھا اور شعروادب کی محفلوں کی سرگرمیاں جاری وساری تھیں۔

ایسے بھرپور ادبی معاشرے کے درمیان مجتبیٰ حسین 1972ء میں بہ سلسلہ ملازمت دہلی چلے گئے۔ اُس وقت تک مجتبیٰ حسین کی شہرت ملک اور بیرون ملک پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا دہلی نے مجتبیٰ حسین کی آمد پر اپنی بانہیں کھول دیں اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے مجتبیٰ حسین دہلی کی سرگرمیوں کے مرکز بنتے چلے گئے۔ دہلی والے انہیں دیکھ کر رشک کرتے تھے کہ دہلی جیسا ظالم شہر جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا مجتبیٰ حسین کا ایسے گرویدہ کس طرح ہوگیا۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے اور مجتبیٰ حسین بھی اس سے متفق ہیں کہ اگر وہ دہلی نہ جاتے تو انہیں وہ سب کچھ میسر نہ آتا جو آج انہیں میسر ہے۔ انہیں دہلی میں بڑی ترقیاں ملیں۔ دہلی کا ادبی، تہذیبی اور سماجی منظرنامہ بھی بہت مستحکم تھا۔ مجتبیٰ حسین نے پوری ایمانداری، دیانت، خلوص اور محبت کے ساتھ اس معاشرے کو قبول کیا۔ مجتبیٰ حسین کو دہلی جانے کے بعد ہی اردو کا پہلا غالب ایوارڈ برائے طنز ومزاح 1984ء میں سابق وزیراعظم اندرا گاندھی کے ہاتھوں حاصل ہوا۔ ملک بھر میں یہیں سے مجتبیٰ حسین کو بے شمار انعامات سے نوازا گیا اور اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

لوگ اکثر پوچھتے ہیں کہ مجتبیٰ حسین کو حیدرآباد سے کونسا انعام ملا؟۔ اس کے جواب میں مجتبیٰ حسین صرف مخدوم محی الدین ایوارڈ کا ذکر کرتے ہیں جو انہیں آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی جانب سے 1994ء

میں دیا گیا تھا۔ مجتبیٰ حسین حیدرآباد اور دہلی کے تعلق سے اکثر کہا کرتے ہیں کہ انہیں حیدرآباد دکن اور شمالی ہند یعنی دہلی میں رہنے کا مساوی عرصہ تک موقع ملا۔ اسی لیے وہ اکثر اپنے آپ کو دوشہرا شہری بھی کہتے ہیں۔ ایک محفل میں کسی نے شرارتاً مجتبیٰ حسین سے یہ سوال پوچھا تھا کہ آپ دہلی کو زیادہ پسند کرتے ہیں یا حیدرآباد کو؟۔ اس کے جواب میں مجتبیٰ حسین نے بھی شرارتاً جواب دیا تھا کہ ''میں حیدرآباد کو پسند کرتا ہوں اور دہلی مجھے پسند کرتی ہے''۔ کچھ لوگ انہیں شمال اور دکن کے درمیان ایک پل بھی سمجھتے ہیں۔ اگرچہ وہ شمال کے ادبی اور تہذیبی معاشرے میں رچ بس گئے لیکن حیدرآباد انہیں ہمیشہ یاد آتا رہا۔ یہی نہیں کئی ملکوں کے سفر کے دوران انہیں جگہ جگہ حیدرآباد یاد آتا رہا۔ ان کے سفرناموں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حیدرآباد کو کتنا عزیز رکھتے ہیں۔ 1972ء میں جب مجتبیٰ حسین دہلی آئے تو اپنے پیچھے حیدرآباد میں اورینٹ ہوٹل کی بے شمار یادوں اور سینکڑوں چاہنے والے دوستوں کو چھوڑ آئے۔ مجتبیٰ حسین کی زندگی میں حیدرآباد کی اورینٹ ہوٹل کا نہایت اہم رول رہا ہے۔ اسی ہوٹل میں ان کی ملاقاتیں مخدوم محی الدین، اختر حسن، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، فراق گورکھپوری، ایم ایف حسین، شاذ تمکنت، آر کے لکشمن، پروفیسر حسن عسکری، عالم خوندمیری، نقی تنویر، وقار لطیف جیسی شخصیتوں سے ان کی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ کئی سیاسی رہنماؤں کے ساتھ بھی جو بعد میں مرکزی و ریاستی حکومتوں کے اہم وزرا بھی بنے مجتبیٰ حسین کی بے تکلفی ہمیشہ برقرار رہی۔ دہلی اور حیدرآباد دونوں میں مجتبیٰ حسین کا حلقہ احباب اتنا وسیع رہا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح مجتبیٰ حسین نے دوستوں کی محبتوں کو سنبھالا ہوگا۔ مجتبیٰ حسین کے دہلی آنے کے بعد جہاں دہلی میں مجتبیٰ حسین کے کئی دوست بننے لگے وہیں حیدرآباد میں ان کے دوستوں کی کمی واقع ہوتی چلی گئی۔ ان کے کئی دوست دکن سے ہجرت کر کے دیگر ممالک چلے گئے۔ بہت سے ان کے ہم عمر دوستوں نے بھی رفتہ رفتہ اس دنیا کو خیر باد کہا۔

2007ء میں جب مجتبیٰ حسین اپنے شہر حیدرآباد واپس ہوئے تو ان کے لیے حیدرآباد تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ 2000ء میں ان کے گھٹنے کی سرجری کے ناکام ہونے کے بعد ان کی نقل و حرکت متاثر ہوگئی تھی لہٰذا وہ حیدرآباد میں لنگڑاتے ہوئے ہی داخل ہوئے تھے۔ اس اعتبار سے مجتبیٰ حسین نے محفلوں میں آنا جانا تقریباً ترک کر دیا ہے اور گوشہ نشینی کی زندگی گذارتے ہیں۔ ان کے طالب علمی کے زمانہ کا اب ایک بھی دوست اس شہر میں باقی نہیں رہا ہے۔ چالیس برس پہلے مجتبیٰ حسین جب ادبی تقاریب میں شرکت کیا کرتے تھے تو ان کا زوردار تالیوں کے درمیان استقبال کیا جاتا تھا۔ آج بھی حیدرآبادی انہیں پسند کرتے ہیں مگر مجتبیٰ حسین غالباً اس لیے کہ ان کا کوئی ہمعصر باقی نہیں رہا وہ اپنے جذبات اور تاثرات نئی نسل سے Share نہیں کر سکتے۔ تاہم مجتبیٰ حسین کے حیدرآباد میں سکونت اختیار کرنے کا ایک مثبت فائدہ یہ پہنچا کہ انہیں یہاں دہلی کی ادبی محفلوں اور مصروفیتوں سے فراغت نصیب ہوئی اور انہوں نے اپنے بے لوث دوستوں جیسے حسن چشتی، حمایت اللہ، سید امتیاز الدین، محمد تقی اور احسان اللہ احمد کی مدد سے اپنی کتابوں کو چھپوانے کا اہتمام کیا۔ چنانچہ ان کی کئی ضخیم کتابیں، اُن کی کالم نگاری، سفرنامہ نگاری، خاکہ نگاری اور انشائیہ نگاری کے بارے میں شائع ہوئیں۔ یہی نہیں مجتبیٰ حسین کے فن اور ان کے کام کے بارے میں ہندوستان بھر میں بیس سے زیادہ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ممتاز محقق، ناقد، شاعر اور مزاح نگار ظفر کمالی نے ان کے نام آئے مشاہیر کے خطوط کو بھی دو جلدوں میں ''بنام مجتبیٰ حسین'' کے عنوان سے ترتیب دیا ہے جو زیر اشاعت ہے۔ روزنامہ سیاست حیدرآباد سے مجتبیٰ حسین کا تعلق بہت گہرا ہے۔ یہیں سے انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا اور ان کی ہر تحریر سب سے پہلے سیاست ہی میں شائع ہوتی رہی۔ روزنامہ سیاست نے پانچ سال کی کڑی محنت کے بعد مجتبیٰ حسین کی بیشتر کتابوں کی ایک ویب سائٹ تیار کی جو ساڑھے سات ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ روزنامہ سیاست نے 80 سے زائد ویڈیوز بنائے ہیں جن میں مجتبیٰ حسین نے اپنے منتخب خاکوں، سفرناموں، کالموں اور انشائیہ نگاری کو ریکارڈ کیا ہے جسے اب ویب سائٹ پر پیش کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ چوں کہ مجتبیٰ حسین حیدرآباد کے اخبار کے لیے کالم لکھتے تھے اسی لیے جگہ جگہ ان کی تحریروں میں حیدرآباد کا ذکر ہوتا ہے۔ سچ پوچھئے تو مجتبیٰ حسین نے ساری اردو دنیا میں حیدرآباد کو روشناس کرانے اور اس کی آن بان اور شان کو برقرار رکھنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کی ہر دلعزیزی کے بارے میں خواجہ حسن ثانی نظامی نے کہا تھا کہ مجتبیٰ کا کوئی دشمن نہیں ہے اور اگر ایسا کوئی دشمن ہے تو اس کے انسان ہونے پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔

بقول مجتبیٰ حسین، شاعر ابن احمد تاج کہا کرتے تھے کہ پہلے تو حیدرآبادی کسی فنکار کو بڑی بلندی تک اُچھال دیتے ہیں مگر جب وہ قانون قدرت کے مطابق زوال پذیر ہو جاتا ہے اور نیچے آنے لگتا ہے تو فوراً اپنے ہاتھوں کا سہارا دینے کے بجائے رفوچکر ہو جاتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین ایک قلندر صفت انسان ہیں اور انہوں نے طنز و مزاح کے فروغ کی خاطر ہمیشہ ایک بے لوث رویہ اختیار کیا۔ مجتبیٰ حسین نے 2017ء میں زندہ دلان حیدرآباد کے صدر کے عہدہ سے استعفیٰ دیدیا اور اس کا سبب یہ بتایا کہ پچاس ساٹھ برس پہلے حیدرآباد میں طنز و مزاح کا جو ماحول فروغ پایا تھا اب دوبارہ ایسا ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اب حیدرآباد کو طنز و مزاح کی راجدھانی کہلائے جانے کا موقع نصیب نہیں ہوگا۔

❑❑❑

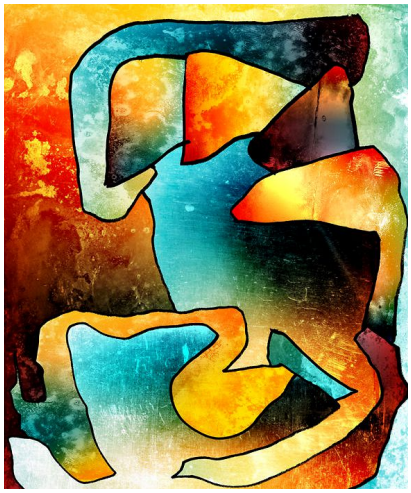

مجتبیٰ حسین
اردو طنز و مزاح کا میر کارواں

رفیق احمد

ڈومن پوروا (مغرب)
مئوناتھ بھنجن، یوپی
رابطہ: 9236126977

طنز و مزاح کو کچھ ناقدین ادب اور دانشورانِ اردو نے تیسرے درجے کا ادب کہا ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے ادب میں تخلیقات کا معیار قارئین کی قلت و کثرت سے نہیں بلکہ فن پارے کے حسنِ اسلوب سے ہے بہترین ادب وہی ہے جو زمان و مکان کی حد بندی سے آزاد ہو۔ اس لحاظ سے اگر اردو طنز و ظرافت کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس فن کو ترقی دینے والوں میں عصر حاضر میں ایک معتبر و مستند نام مجتبیٰ حسین کا ہے جنہوں نے اردو کے مزاحیہ ادب میں اپنی نمائندہ تحریروں کے ذریعہ بلند مقام حاصل کیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے یہاں طنز کے تیر و نشتر بھی ہیں اور ظرافت کے حسین گلدستے بھی انہوں نے بھرپور طنز کے ساتھ مزاح کی آمیزش سے اردو ظرافت نگاری کو جو قابل رشک اسلوب تحریر عطا کیا ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔

مجتبیٰ حسین نے طنز و ظرافت کے ساتھ اردو خاکہ نگاری کو بھی اپنی نمائندہ تحریروں سے معتبر و معیاری بنانے کا جو اہم کارنامہ انجام دیا اس کا اعتراف اپنے اور بیگانے سب نے کیا ہے۔ اردو خاکہ نگاری کو مجتبیٰ حسین نے جو جدید سمت و رفتار عطا کی ہے اس کا اندازہ ان کے خاکوں کے مجموعے کے مطالعہ سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ ان کی تحریروں میں طنز کے ذریعہ ادب برائے تعمیر کا نظریہ پیش ہوا ہے وہ کسی کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں تو اس سے تنقید برائے تعمیر ہی مقصود ہوتی ہے ان کے طنز میں بھی ہنسی کا پہلو پوشیدہ رہتا ہے انہوں نے زمانے کے تجربات و مشاہدات کو جس خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے مجتبیٰ حسین کے طنز و مزاح میں درد الم، گہری کاٹ، ہنسی اور آہ کے ساتھ ہی ظرافت کا پہلو غالب رہتا ہے انہوں نے زندگی سے جو کچھ سیکھا ہے اور زندگی نے ان کو جو پیغام دیا ہے وہ صحیح معنوں میں اس شعر کے مصداق ہے:

ہم نے ہنس ہنس کے تیری بزم میں اے پیکر ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

(مخدوم محی الدین)

مجتبیٰ حسین نے اپنے مختصر سوانحی خاکہ میں اپنی ولادت، تعلیم اور ظرافت نگاری کے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا ہے: ''۱۵ر جولائی ۱۹۳۶ء کو ضلع گلبرگہ (کرناٹک) میں پیدا ہوا، ۱۹۵۶ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کی تکمیل کی، اسی سال حیدرآباد کے روزنامہ ''سیاست'' سے وابستہ ہوا ۱۶ر مئی تک اسی اخبار کا

طنزیہ کالم لکھتا رہا، ۱۲ / اگست ۱۹۶۲ء کو صبح ساڑھے دس بجے مزاح نگاری شروع کی، ہندوستان کی کئی زبانوں میں میرے مضامین کے ترجمہ شائع ہو چکے ہیں۔

(دستاویز (مصنفین کے اپنے قلم سے) اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ ۱۹۸۳ء ص ۳۰۷)

مجتبیٰ حسین کا شمار ایسے خوش نصیب افراد میں ہوتا ہے جن کا خاندان اور گھرانہ ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کے مصداق ہے ان کے دادا محمد حسین نے عثمان آباد، مہاراشٹر کی ایک سرکاری آفس میں حالات کی ستم ظریفی کی وجہ سے کلرکی کا پیشہ اختیار کیا جب کہ ان کے آباو اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا محمد حسین کی چار نرینہ اولادوں میں دوسرے نمبر پر مولوی احمد حسین تھے جو عثمان آباد میں پیشکار رہے واضح ہو کہ احمد حسین گلبرگہ کرناٹک میں تحصیلدار کے عہدے پر بھی رہے احمد حسین ۱۹۴۶ء تک گلبرگہ میں رہے اس کے بعد انہوں نے عثمان آباد میں سکونت اختیار کی اور اسے اپنا وطن ثانی بنایا۔

مجتبیٰ حسین کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم گلبرگہ میں ہوئی یہیں سے انہوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے وہ حیدرآباد آگئے یہاں پر انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو قیام ہاسٹل میں رہا اپنی ہاسٹل لائف کا تذکرہ انہوں نے اس طرح کیا ہے:

''اپنی چھوٹی سی زندگی کا نصف حصہ ہوسٹلوں میں گزار چکا ہوں اس لئے اپنے گھر کو بھی ہوسٹل کی طرح استعمال کرتا ہوں اور بیوی کو وارڈن سمجھتا ہوں''

عصر حاضر میں اردو طنز و مزاح نگاری اور خاکہ نویسی کو جن اہم لوگوں نے اپنی نمائندہ اور معیاری تحریروں سے ترقی دی اور وقار بخشا ہے ان میں نامور اور بلند پایہ ادیب، دانشور، طنز و ظرافت کے بے تاج بادشاہ اور عالمی شہرت یافتہ خاکہ نگار مجتبیٰ حسین کا نام سر فہرست ہے۔ موجودہ دور میں مجتبیٰ حسین نے اردو خاکہ نگاری اور طنز و ظرافت نگاری کو نئی اور جداگانہ سمت و رفتار عطا کی ہے ان کے خاکوں کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ معمولی سے معمولی بات کو بڑے ہی سلیقے سے بیان کرنے کے فن پر قدرت کاملہ رکھتے ہیں ان کے خاکوں میں طنز کے تیر و نشتر بھی پیوست ہیں اور ظرافت و مزاح کی پھلجھڑی کے ساتھ تبسم زیر لب کی حسین کیفیت بھی موجود ہے انہوں نے حقیقت میں خاکہ نگاری کے فن کو وہ معیار و توازن عطا کیا ہے جس کی مثال اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں ان سے پہلے بہت کم ہی نظر آتی ہے۔

مجتبیٰ حسین کی ادبی و صحافتی زندگی کا آغاز حیدرآباد کے مشہور روزنامہ اخبار ''سیاست'' کے مزاحیہ کالم نگار شاہد صدیقی کی وفات کے بعد ۱۹۶۲ء میں ہوا ان دنوں ''سیاست'' کے ایڈیٹر عابد علی خاں اور بانی جوائنٹ ایڈیٹر مجتبیٰ حسین کے بڑے بھائی محبوب حسین جگرؔ تھے، شاہد صدیقی کی وفات کے بعد جگرؔ نے اپنے چھوٹے بھائی مجتبیٰ حسین کو مزاحیہ کالم ''شیشہ و تیشہ'' لکھنے کا حکم دیا اس طرح ان کی ادبی زندگی کی شروعات صحافت اور کالم نگاری سے ہوتی ہے، شروع میں مجتبیٰ حسین ''سیاست'' کا مزاحیہ کالم ''کوہ پیما'' کے قلمی نام سے لکھا کرتے تھے بعد میں ''میرا کالم'' کے عنوان سے وہ اسی اخبار میں بہت دنوں تک پابندی کے ساتھ ہر ہفتے مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ مجتبیٰ حسین کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز اس وقت ہوا جب ان کا سب سے پہلا مزاحیہ مضمون ''غالب کے طرفدار'' کے عنوان سے ماہنامہ ''ضیا حیدرآباد'' میں ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ (ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں)

اردو طنز و مزاح اور خاکہ نگاری کے حوالے سے مجتبیٰ حسین ایک ایسا مستند معتبر اور منفرد نام ہے جس کی ادبی زندگی کو پروان چڑھانے میں ان کے خاندانی ماحول، پس منظر اور علمی و ادبی وراثت کو بڑا دخل رہا ہے اس سلسلے میں یہ بات انتہائی قابلِ ذکر ہے۔ کہ مجتبیٰ حسین کے سب سے بڑے بھائی محبوب حسین جگرؔ تھے جو اس زمانے میں اردو صحافت سے وابستہ تھے اور حیدرآباد سے شائع ہونے والے مشہور روزنامہ ''سیاست'' کے بانی اور جوائنٹ ایڈیٹر ہوا کرتے تھے اس کے علاوہ ابراہیم جلیس کے نام سے ہم سب واقف ہیں جو ۱۹۴۸ء میں ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے اور آزاد صحافت کو اپنا پیشہ بنایا اردو ادب میں آپ کا شمار نامور ادیب و صحافی اور افسانہ نگار کی شکل میں ہوتا ہے آپ کے رپورتاژ ''دو ملک ایک کہانی'' کو بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اور اسے تقسیم ہند کا دستاویز کہا جانے لگا ''الٹی قبر'' اور ''پتے کی بات'' ان کی مشہور تخلیقات ہیں اردو کا یہ نامور دانشور اور افسانہ نویس بھی مجتبیٰ حسین کا حقیقی بھائی تھا۔ واضح رہے کہ مجتبیٰ حسین نے اپنی مزاح نگاری کے محرک کے تعلق سے ایک جگہ لکھا ہے:

''مجھ جیسے سنجیدہ آدمی کو خواہ مخواہ مزاح نگار بنانے کی ذمہ داری میرے بھائی محبوب حسین جگر اور ایڈیٹر ''سیاست'' میر عابد علی خان پر عائد ہوتی ہے انہیں بزرگوں اور سرپرستوں کے حکم کی تعمیل میں ۱۲ / اگست ۱۹۶۲ء کو دن کے ٹھیک ساڑھے دس بجے مزاح نگاری کا آغاز کیا اور یہ نان اسٹاپ سلسلہ تادمِ تحریر جاری ہے''۔

(قصہ مختصر ''میں اور میرا مزاح'' مجتبیٰ حسین۔ مطبوعہ حسامی بک ڈپو حیدرآباد۔ اپریل ۱۹۷۲ء ص ۱۶)

راقم الحروف کو دہلی، حیدرآباد اور شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ میں اردو زبان ادب کے اس مایۂ ناز ادیب و دانشور اور خاکہ نگار سے ملاقات اور اظہار خیال کا شرف حاصل رہا ہے اور کئی بار فون پر بھی گفتگو ہوئی ہے وہ ایک بلند پایۂ ادیب ہونے کے ساتھ ہی اعلیٰ قدروں کے حامل اور عمدہ اخلاق والے انسان ہیں نرم گفتاری ان کی نمایاں خوبی ہے

وہ ہر چھوٹے بڑے سے بڑی عاجزی اور انکساری سے ملتے ہیں ہمدردی ان کا شیوہ اور انسانیت دوستی ان کا اصل مذہب ہے۔مجتبیٰ حسین عمر کی ایسی منزل پر ہیں جہاں انہیں آرام کی سخت ضرورت ہے مگر اردو کا یہ شیدائی ضعف اور پیرانہ سالی کے باوجود بھی تخلیقی سفر کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔اپنی بے شمار علمی و ادبی اور سماجی و ثقافتی مصروفیات کے باوجود بھی وہ مسرت سے بھرپور اور کامیاب زندگی بسر کررہے ہیں۔

مجتبیٰ حسین نے اردو طنز وظرافت،مزاح نگاری اور خاکہ نگاری کو موجودہ دور میں اپنی نمائندہ تحریروں سے جو وقار بخشا ہے اسے ہم آسانی سے فراموش نہیں کرسکتے ہیں ان کی کتابوں کی تعداد تقریباً دو درجن تک ہیں۔

مجتبیٰ حسین کی ادبی زندگی کا باضابطہ آغاز مزاحیہ نگاری سے ہوتا ہے اس سلسلے میں ان کے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ۔

(۱) ''تکلف برطرف'' کے نام سے نیشنل بک ڈپو حیدر آباد سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا ۔(۱۲۸) صفحات پر مشتمل اس مجموعہ میں کل چودہ مزاحیہ مضامین شامل ہیں۔ ان کا پہلا مزاحیہ مضمون ''ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں'' اس کتاب میں شامل ہے

(۲) ''قطع کلام'' ان کے مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے جس میں چودہ مزاحیہ تحریریں ، اور دو خاکے شامل ہیں ۔ یہ مجموعہ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا صفحات کی مجموعی تعداد (۱۵۱) ہے ، نمائندہ مضمون ''رکشہ والے'' اس مجموعہ میں شامل ہے۔

(۳) '' قصہ مختصر'' مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضامین کا تیسرا مجموعہ ہے جو ۱۹۷۲ء میں حسامی بک ڈپو حیدر آباد سے شائع ہوا۔ ۱۴۵ صفحات پر محیط اس مجموعے میں کل ۹ مضامین اور تین خاکے شامل ہیں،مجتبیٰ حسین نے اپنی زندگی اور مزاحیہ نگاری کے بارے میں ایک مضمون ''میں اور میرا مزاح'' کے نام سے لکھا ہے جو انتہائی مستند اور معلوماتی ہے یہ مضمون اور مشہور آرٹسٹ محمد فدا حسین پر ایک خاکہ اس مجموعہ میں شامل ہے اس مجموعہ کے تقریباً سبھی مضامین میں سماجی مسائل اور الجھنوں کی عکاسی بڑے اچھے انداز میں کی گئی ہے۔

(۴) ''بہر حال'' ۹ مضامین اور ۴ خاکوں کا یہ مجموعہ بھی ۱۹۷۲ء میں مذکورہ پریس سے شائع ہوا جس میں صفحات کی مجموعی تعداد ۱۴۷ ہے ۔ اس مجموعہ کا نمائندہ مضمون '' قصہ داڑھ کے درد کا'' ہے جو اردو کے مزاحیہ ادب میں کافی مشہور اور مقبول ہوا ، نامور طنز و مزاح نگار فکر تونسوی پر ایک خاکہ بھی اس مجموعہ میں شاملِ اشاعت ہے۔اس مجموعہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے سماج پر بڑی باریک بینی سے طنز کیا ہے۔

(۵) ''آدمی نامہ'' اصناف ادب میں اردو شاعری کے حوالہ سے آدمی نامہ کی وجہ سے نظیر اکبر آبادی کے بعد کسی کو شہرت نصیب ہوئی ہے تو نثری ادب میں مجتبیٰ حسین قابل ذکر ہیں ۔'' آدمی نامہ'' ان کے پندرہ نمائندہ خاکوں کا عمدہ مجموعہ ہے۔ ۱۶۸ صفحات پر مشتمل پر یہ مجموعہ ۱۹۸۱ء میں منظر عام پر آیا اس میں فکر تونسوی پر ایک خاکہ ''بھیڑ کا آدمی'' شاملِ اشاعت ہے۔

(۶) ''بالآخر'' مجتبیٰ حسین کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا ایک ایسا مجموعہ جس میں سولہ مضامین شامل ہیں۔ طنزیات سے بھرپور یہ مجموعہ ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آیا جس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۴۱ ہے اس کتاب کا نمائندہ مضمون ''اردو کا آخری قاری'' اور ''ڈائرکٹر کا کتا'' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔''ڈائرکٹر کا کتا'' نامی مضمون میں آفس کے ایک کلرک کا ٹفن باکس جب کتا لے کر فرار ہونے لگتا ہے تو کلرک کا ردعمل یوں ظاہر ہوتا ہے:

''دوستو! یہ ٹفن باکس اسکے منہ سے چھینو۔ یہ میری عزت کا سوال ہے ، اگر کتے نے باکس کھول لیا تو میں کسی کو منھ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا ، آج تک دفتر میں کسی کو یہ پتا نہیں ہے کہ میں سالن کے بغیر ہی ایک چپاتی ٹفن بکس میں ڈال کر لاتا ہوں ، پھر یہ اکلوتی چپاتی بھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے ڈائرکٹر صاحب کا کتا کھا سکے''۔

مجتبیٰ حسین نے اس مضمون میں موجودہ دور کے افسر شاہی اور نوکر شاہی نظام پر بہت ہی تلخ آمیز اور حقیقت سے لبریز طنز کیا ہے۔

(۷) ''جاپان چلو جاپان چلو'' اردو طنز و ظرافت کی تاریخ میں بہت ہی کم ادیب اور دانشور ایسے گزرے ہیں جنہوں نے طنز و مزاح کے اسلوب میں کامیاب سفر نامے بھی لکھے ہوں اس سلسلے میں مجتبیٰ حسین کی شخصیت قدرے مختلف ہے وہ صرف طنز و مزاح نگار خاکہ نگار ہی نہیں ہیں بلکہ انہوں نے اردو ادب میں سفر نامہ نگاری اور روداد سفر لکھنے کے فن کو نئی شاہراہ پر گامزن کیا ہے۔ان کے سفر نامہ میں مبالغہ آرائی اور لفظی بازی گیری سے اجتناب کے ساتھ ہی حقیقت اور صداقت بیانی کا پہلو غالب رہتا ہے۔اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو وہ موجودہ صدی کے کامیاب ترین سفر نامہ نویس ہیں جن کا مشہور سفر نامہ ''جاپان چلو جاپان چلو'' اپنے نمائندہ اسلوب،طنز بیان اور اندازِ تحریر کی وجہ سے بڑی افادیت و اہمیت کا حامل ہے۔

۱۹۸۰ء میں مجتبیٰ حسین کو ۳۵ دنوں کے لئے جاپان جیسے عظیم ملک کی سیر و سیاحت کا خوشگوار موقع نصیب ہوا وطن واپسی کے بعد انہوں نے روداد سفر کو تفصیل سے لکھا جو ۱۹۸۳ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ یہ سفر نامہ (۱۷۴) صفحات پر محیط ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اس سفر نامہ میں جاپان کی مختصر تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے ساتھ ہی وہاں کے لوگوں کے معاشرتی و تمدنی حالات و کوائف کو قدرے تفصیل سے پیش کیا ہے مجتبیٰ حسین نے اس سفر نامہ میں ایک جگہ صفحہ ۳۰ پر لکھا ہے کہ ''جاپانیوں کی ہر چیز چھوٹی ہوتی ہے سوائے کردار کے''۔

(۸) ''الغرض'' طنز و ظرافت سے بھر پور مزاحیہ تحریروں کا یہ مجموعہ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا جس کے صفحات کی مجموعی تعداد ایک سو پچاس ہے اس مجموعہ میں کل ۱۷ مضامین شامل ہیں ''خوشامد کا فن'' اور ''خوش فہمی'' اس کے نمائندہ مضامین ہیں۔

(۹) ''سو ہے وہ بھی آدمی'' اس مجموعہ میں مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری اپنے عروج پر ہے بارہ خاکوں پر مشتمل یہ مجموعہ ۱۹۸۷ء میں حیدر آباد سے شائع ہوا جسکے صفحات کی تعداد ۱۸۸ ہے اس مجموعہ میں اردو کے نامور ادیب اور دانشور پروفیسر خورشید الاسلام اور مشہور صحافی خوشونت سنگھ پر خاکے شامل ہیں۔

(۱۰) ''چہرہ در چہرہ'' خاکوں کا یہ مجموعہ موضوعات کے انتخاب اور انفرادیت کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے ۱۶ عدد خاکوں پر مشتمل اس مجموعہ کی اشاعت ۱۹۹۳ء میں مکتبہ جامعہ دہلی سے ہوئی جس میں ۱۵۲ صفحات ہیں اس مجموعہ کے منفرد اور نمائندہ خاکوں میں اندر کمار گجرال، جوگندر پال، خواجہ احمد عباس اور ظ۔ انصاری پر لکھے ہوئے خاکے اسلوب اور پیش کش کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

(۱۱) ''سفر لخت لخت'' اردو سفر ناموں میں مجتبیٰ حسین کے لکھے ہوئے علمی و ادبی سفر نامے اپنی افادیت و انفرادیت کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں اس تناظر میں اگر دیکھا جائے تو مجتبیٰ حسین کا یہ سفر نامہ جو ۱۴۹ صفحات پر مشتمل ہے جسے ۱۹۹۵ء میں حسامی بک ڈپو حیدر آباد نے شائع کیا انتہائی معلوماتی اور قابلِ مطالعہ ہے۔

(۱۲) ''آخر کار'' طنزیہ و مزاحیہ موضوعات پر مشتمل یہ مجموعہ ۱۹۹۷ء میں نئی دہلی سے شائع ہوا۔ جس میں کل صفحات ۱۲۰ ہیں ''صاحب باتھ روم میں ہیں''، ''مشاعروں کے شاعر'' اور ''معذرت نامہ'' اس مجموعہ کے نمائندہ اور اہم مضامین ہیں۔ ''معذرت نامہ'' کے عنوان سے دلیپ سنگھ نے بھی ایک مزاحیہ مضمون لکھا ہے۔

اسکے علاوہ مجتبیٰ حسین نے ادبی و سیاسی موضوعات پر ''تماشائے اہل کرم'' لکھی۔

اردو کے عام ادیبوں اور شاعروں کی طرح ''قدر مردم بعد مردن'' والا فارمولہ ان کے ساتھ لاگو نہیں ہے بلکہ ان کے جیتے جی پروفیسر شکیل الرحمن نے ''مجتبیٰ حسین کا فن اور ڈاکٹر افسر کاظمی نے مجتبیٰ حسین بحیثیت طنز نگار'' لکھ کر ان کی علمی و ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

حیدر آباد سے ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ایڈیٹر ماہنامہ ''شگوفہ'' نے ایک خصوصی شمارہ ۴۸۸ صفحات پر مشتمل مجتبیٰ حسین نمبر شائع کیا اس کے علاوہ اردو کے اہم رسائل جرائد مثلاً ''الفاظ'' علی گڑھ وغیرہ نے مجتبیٰ حسین پر خصوصی گوشے شائع کئے ہیں۔

مختصر یہ کہ اردو طنز و مزاح نگاری کے حوالے سے موجودہ صدی میں مجتبیٰ حسین کا نام بڑی انفرادیت کا حامل ہے، ہمیں پُر امید رہنا چاہئے کہ ان کے تخلیقی سفر کا سلسلہ تادیر قائم و جاری رہے گا۔

❑❑❑

'نیا دور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیا دور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہر حال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔ تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی۔ایف۔ایس۔سی، برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔ **مصنف کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات کے بغیر حاصل ہونے والی تخلیقات کسی بھی صورت میں شائع نہیں کی جائیں گی کیونکہ اس کے سبب ہی دیگر تخلیق کاروں کے اعزازیہ میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔ بغیر بینک تفصیلات کے تخلیقات ارسال کرنے والے اعزازیہ کے حقدار نہیں ہوں گے۔**

مجتبیٰ حسین
کی شخصیت اور ادبی خدمات

صابر علی سیوانی

C/12/87-4-9
فرسٹ فلور، عقب مغل ریزیڈنسی
ٹولی چوکی، حیدرآباد
رابطہ: 9989796088

مجتبیٰ حسین کی شخصیت کا نمایاں بلکہ قابل تقلید پہلو یہ ہے کہ وہ وقت کے بہت پابند ہیں۔ وقت کی پابندی نہ کرنے والوں سے وہ سخت نفرت کرتے ہیں۔ وہ جب بھی کسی کو وقت دیتے ہیں تو اس مقررہ وقت پر جائے ملاقات پر موجود رہتے ہیں۔ اگر کسی بھی ادبی جلسے کی صدارت کرنی ہوتی ہے تو وہ مقررین تو کیا سامعین سے بھی پہلے اسٹیج پر موجود رہتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ جلسہ گاہ میں کوئی موجود نہیں ہے تو یہی شکایت کرتے ہیں کہ 'اردو والوں کا یہی حال ہے۔ وہ کبھی وقت پر جلسے میں نہیں پہنچتے'۔ اسی طرح اگر کوئی صاحب ان کا فون جلد ریسیو نہیں کرتے تو وہ فوراً خفا ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عجیب حال ہے، لوگوں کو فون کلچر ہی نہیں معلوم ہے۔ وقت کی پابندی نہ کرنے والوں کو سخت لعن طعن کرتے ہیں۔ اپنی پابندیٔ وقت کے متعلق انہوں نے نہایت شگفتہ اور مزاحیہ انداز میں گلزار جاوید، ایڈیٹر چہارسو (راولپنڈی) کو دئے گئے اپنے ایک انٹرویو بعنوان براہِ راست میں اظہار کیا ہے۔ چہارسو نے جنوری فروری ۲۰۱۵ء کے شمارے میں ۵۶ صفحات میں مجتبیٰ حسین کا گوشہ شائع کیا تھا۔ گلزار جاوید نے مشتاق احمد یوسفی کے ایک ول کا حوالہ دیتے ہوئے مجتبیٰ حسین سے سوال کیا کہ 'اگر مشتاق یوسفی کا یہ بیان درست ہے کہ آپ کی کامیابی میں تین گُر ہیں یعنی تکرار سے پرہیز، تروتازگی اور قلم برداشتہ لکھنا۔ مگر ہم آپ کے منھ سے آپ کی تین خامیاں سننا چاہیں گے۔'

اس دلچسپ سوال کا نہایت خوبصورت اور مزاح سے پُر جواب دیتے ہوئے مجتبیٰ حسین نے کہا کہ 'جہاں تک مشتاق احمد یوسفی صاحب کے اس بیان کا تعلق ہے، اس بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خود یوسفی صاحب نے ان باتوں کا ذکر واشنگٹن کی ایک ملاقات میں مجھ سے کیا تھا۔ رہی بات اپنی تین خامیوں کے ذکر کی تو اس سلسلہ میں عرض کرنا ہے کہ مجھ میں اتنی خامیاں ہیں کہ کس خامی کا ذکر کروں۔ کوئی ایک ہو تو بتاؤں بھی۔ تاہم آپ کی تسلی اور تشفی کے لئے اپنی تین خامیوں کا ذکر کئے دیتا ہوں۔ پہلی خامی یہ ہے کہ میں اردو کے جلسوں میں ہمیشہ مقررہ وقت پر پہنچ جاتا ہوں جب کہ وہاں کوئی بھی موجود نہیں ہوتا۔ دوسری خامی یہ ہے کہ میں ہمیشہ غلط موقع پر صحیح رائے دیتا ہوں اور تیسری خامی یہ ہے کہ میں ہمیشہ اپنا مذاق خود اڑاتا ہوں تاکہ غیروں کو مذاق اڑانے کا موقع نصیب نہ ہو۔'

(ماہنامہ چہارسو، ص ۲۲)

اگر آپ مجتبیٰ حسین کے سامنے ہندوستان کے کسی بڑے ادیب، ناقد یا شاعر کا تذکرہ چھیڑ دیں تو وہ فوراً بول اٹھتے ہیں کہ وہ شخص میرا بہت بڑا Admirer ہے۔ اکثر فون پر اس سے باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ وہ ہماری تحریروں کو بہت پسند کرتا ہے۔ اگر کسی ادیب قلمکار یا یونیورسٹی کے کسی استاد سے کوئی مضمون یا کسی جاننے والے شخص کی کتاب پر تبصرہ لکھنے کو پابند کرتے ہیں تو اتنی دفعہ ٹیلی فون کرتے ہیں کہ اگلا شخص جھنجھلا جاتا ہے اور اگر وہ ان کی مرضی کے مطابق وقت پر ان کا سونپا ہوا کام نہیں کرتا ہے تو میں نے صاف لفظوں میں اس کے متعلق یہ تک کہتے ہوئے سنا کہ 'ان لوگوں کا حال دھوبیوں اور درزیوں والا ہے جو کبھی بھی وقت پر کام مکمل کر کے نہیں دیتے۔'

دہلی میں دوران ملازمت انہوں نے سیکڑوں لوگوں کی رہبری کی ہے۔ بہتوں کی سفارش کر کے انہیں اچھی جگہوں پر رکھوایا ہے۔ دہلی میں انہیں ہر مرض کی دوا تصور کیا جاتا تھا۔ اردو اخبارات کے سطحی معیار اور ادھوری اور بے تکی خبروں کے بارے میں وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ اردو اخبار کو سمجھنے کے لئے ہمیں انگریزی اخبار 'دی ہندو' کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

مجتبیٰ حسین طنز و مزاح نگاری کے اوصاف میں ایک صفت بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

'ظرافت نگاری کے لئے انسان کو ظریف ہونا ہی ضروری نہیں ہوتا بلکہ اس کا باظرف ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ طنز و مزاح نگاری کا عمل سنجیدہ مضمون نگاری سے کہیں مشکل کام ہے۔'

اپنے کالم 'ایک خطبۂ صدارت' میں لکھتے ہیں:

میرا ذاتی خیال ہے کہ طنز و مزاح سے معمور، دو چست، شگفتہ اور برجستہ جملے لکھنا کسی سنجیدہ تحریر کے دو صفحے لکھنے سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی زبان کے عصری طنز و مزاح نگاروں کی فہرست تیار کی جائے تو انہیں گننے کے لئے ایک ہاتھ کی پانچ انگلیاں بھی فالتو نظر آتی ہیں۔

(مجتبیٰ حسین کے بہترین کالم، مرتب صابر علی سیوانی، ص ۲۳۲)

اپنے مضمون 'یہ رکشے والے' میں اشارہ کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین صرف دو جملے لکھتے ہیں لیکن ان دو جملوں میں طنز کی جو کاٹ ہے وہ دیکھئے:

'وہ صاحب حیرت سے بولے، آٹھ آنے! بس کا کرایہ تو صرف دس پیسے ہوتا ہے۔ اس پر رکشہ والے نے کہا، بس پٹرول سے چلتی ہے اور رکشہ خون سے چلتا ہے۔'

اپنے ایک مضمون 'نیا سال پرانا جال' میں اپنی تہذیبی جڑوں سے دوری اور مغرب کی اندھی تقلید میں پاگل ہونے والی ہندوستانی قوم کے تہذیبی دیوالیہ پن پر جس طرح طنز کیا ہے اس سے کسی بھی قاری یا سامع کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

'گزشتہ سال ایک صاحب نے ایک کلاتھ مرچنٹ کی دوکان سے کپڑا خریدنے کے بعد ایک برہنہ کلینڈر حاصل کیا تھا۔ اس پر ہم نے موصوف سے دست بستہ یہ پوچھا تھا کہ قبلہ! یہ کپڑا آپ نے اپنے لئے خریدا ہے یا کلینڈر کے لئے۔ اگر ہو سکے تو اس کپڑے کا ایک غلاف کلینڈر کے لئے بھی سلوا لیجئے۔'

(قطع کلام، ص ۸۵)

سطحی کلام کو ترنم کے ساتھ مشاعروں میں سنانے والے شاعروں کو ہدف طنز بناتے ہوئے جو بلیغ جملہ مجتبیٰ صاحب نے ایک مضمون 'علامہ نارسا کی وفات مسرت آیات' میں لکھا ہے، اس کے آگے ناقدین ادب کے کئی تنقیدی مضامین بھی ناکافی ہو سکتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

'علامہ کے کلام کی واحد خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ اس میں ترنم کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اگر ان کے کلام میں سے ترنم کو نکال دیا جائے تو کلام میں تخلص کے سوائے کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا تھا۔'

(تکلف برطرف، ص ۴۱)

مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں سے مجتبیٰ حسین کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس کے اثرات ان کی تحریروں میں پائے جاتے ہیں۔ ہمیں یہاں یوسفی کا جملہ یاد آ گیا جو انہوں نے اپنے مخصوص وضع کردہ کردار مرزا عبدالودود بیگ کی زبانی کہلوایا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں 'چراغ تلے' کی اشاعت عمل میں آئی تھی۔ اس کتاب میں اپنا تعارف کراتے ہوئے مشتاق احمد یوسفی نے بڑا دلچسپ اپنا خاکہ اڑایا ہے۔ انہوں نے مقدمۂ شعر و شاعری کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہی:

'بعض کتابیں اپنے مقدمہ کی وجہ سے شہرت رکھتی ہیں۔ بقول مرزا عبدالودود بیگ۔ اس کتاب میں سے مقدمہ نکال دیا جائے تو صرف سرورق باقی رہ جاتا ہے۔'

یوسفی صاحب کے اس جملے اور مجتبیٰ حسین کے مذکورہ فقرے میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے بہت فکر انگیز اور لطف انگیز انشائیے لکھے ہیں۔ 'دیمکوں کی ملکہ سے گفتگو' مجتبیٰ حسین کا ایک پر لطف انشائیہ ہے۔ کتابوں سے قارئین کی عدم دلچسپی اور کتب خانوں سے استفادہ نہ کئے جانے کے بڑھتے رجحان پر اس مضمون میں دیمکوں کی زبانی طنز کیا ہے:

'میں یہاں آرام سے رہنے لگی ہوں تو تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے۔ میں نے پوچھا، تمہیں یہاں سکون کس طرح مل جاتا ہے؟ بولی، ان کتابوں کو پڑھنے کے لئے اب یہاں کوئی نہیں آتا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ ساری کتابیں میرے لئے فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کا درجہ رکھتی ہیں۔ شرما کر بولی، مجھے یہ کہتے ہوئے لاج سی آتی ہے کہ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو تو اب

میرے سوائے کسی اور کا شکریہ ادا نہیں کرنا چاہئے کیونکہ بالآخر میں ہی ان کی کتابوں میں پائی جاتی ہوں ورنہ انہیں کون پوچھتا۔'

مجتبیٰ حسین کے انشائیوں میں جس طرح کی انشاء پردازی، بذلہ سنجی، زندگی کی صداقتیں، ادبی صورت حال، اردو کی زبوں حالی اور ادب سے دوری کی مثالیں ملتی ہیں اس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ معاشرے کی بدلتی قدروں سے پوری طرح واقف ہیں۔

اب ذرا مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری کے حوالے سے گفتگو کر لی جائے جس کے وہ مرد میدان تصور کئے جاتے ہیں۔ ان کے خاکوں کے اب تک پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان مجموعوں کے نام آدمی نامہ (۱۹۸۱ء) سو ہے وہ بھی آدمی (۱۹۸۷ء) چہرہ در چہرہ (۱۹۹۳ء) ہوئے ہم دوست جس کے (۱۹۹۵ء) مہرباں کیسے کیسے (۲۰۰۹ء) ہیں جن میں بالترتیب ۱۵، ۹، ۲۰، ۱۷، ۴۴ خاکے شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی دیگر کتابوں 'قطع کلام'، 'قصہ مختصر' اور 'بہر حال' میں ترتیب وار دو تین اور چار خاکے موجود ہیں۔ مجموعی طور پر ان کے اب تک لکھے گئے خاکوں کی تعداد ۱۱۴ بنتی ہے۔

نامور افسانہ نگار بیگ احساس کے ۲۰۱۳ء میں یونیورسٹی آف حیدرآباد سے رٹائرمنٹ کے بعد ان کے اعزاز میں منعقد ایک جلسہ میں مجتبیٰ حسین نے 'بیگ احساس تم ہی ہو' عنوان سے اپنا خاکہ سنایا تھا۔ اس خاکے میں بیگ احساس کی ہمیشہ جوان بنے رہنے کی کوشش اور ان کی نفاست پسندی کے حوالے سے دلچسپ واقعات بیان کئے ہیں۔ ضمناً اردو کے پروفیسروں اور ان کی اولادوں کی اردو سے دوری کے تعلق سے بھی کئی حیرت انگیز قصے لکھے ہیں۔ بیگ احساس بالوں کو جتن سے رنگنے اور اپنے آپ کو جوان برقرار رکھنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی اسی ادا کو مرکز نگاہ رکھتے ہوئے مجتبیٰ صاحب لکھتے ہیں:

'عجیب بات یہ ہے کہ بیگ احساس اپنے آپ کو جوان رکھنے یا ظاہر کرنے کی خاطر کسی ایسے بھاری بھرکم میک اپ کو بھی اختیار کرنے کے قائل نہیں ہیں جس سے گزار کر آدمی جوان کم جوکر زیادہ نظر آنے لگتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اپنے بالوں کو بڑے جتن کے ساتھ خضاب سے رنگتے ہیں۔ یہ نکتہ قابل غور ہے کہ صرف بالوں کی سفیدی ضعیفی کی علامت نہیں ہوتی۔ مجھے اس وقت احمد ندیم قاسمی مرحوم یاد آ گئے جن کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے سر کے بال جوانی ہی میں سفید ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنی جوانی سفید بالوں کے ساتھ ہی گزار دی۔ تاہم بہت دیر بعد میں بعض دوستوں کے مشورے پر انہوں نے اپنے بالوں کو خضاب سے رنگنا شروع کر دیا۔ ایک محفل میں احمد ندیم قاسمی کے ایک دوست نے ایک صاحب کا تعارف احمد ندیم قاسمی سے کرانے کی کوشش کی تو ان صاحب نے کہا، حضور! آپ احمد ندیم قاسمی کا تعارف مجھ سے کیا کرائیں گے۔ میں تو انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب ان کے بال سفید ہوا کرتے تھے۔

(مشمولہ چہار سو، راولپنڈی، شمارہ مئی جون ۲۰۱۸ء، ص ۱۷)

یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ جن صاحب سے احمد ندیم قاسمی کا تعارف کرایا جارہا تھا وہ شخص مجتبیٰ حسین ہی تھے۔ اس طرح کے واقعات سے دلچسپی پیدا کرنے کا ہنر وہ بخوبی جانتے ہیں۔

اس خاکے میں آگے لکھتے ہیں:

'بیشک میں نے اردو کے انہیں پروفیسروں کا مذاق اڑایا ہے جنہیں اردو سے محبت نہیں ہے اور وہ اپنے پیشہ اور اس کی حرمت کا کبھی لحاظ نہیں رکھتے۔ ایک دن میں نے اردو کے ایک پروفیسر کے گھر جا کر کال بیل بجائی۔ اس پر معصوم و مظلوم بچے نے وہیں سے اپنا منھ پلٹا کر بہ آواز بلند اپنی ماں سے پوچھا، 'ممی! کیا ہمارے گھر میں کوئی والد صاحب قبلہ بھی رہتے ہیں؟' اس کے اس معصوم سوال پر میں دل مسوس کر رہ گیا۔ افسوس ہوا کہ اردو کے پروفیسر ہونے کے باوجود پروفیسر صاحب نے کبھی اپنے بیٹے کو یہ نہیں بتایا کہ وہ انگریزی میں اسکے ڈیڈی ہونے کے علاوہ اردو میں اس کے والد صاحب قبلہ بھی کہلائے جاتے ہیں۔'

(ایضاً، ص ۱۷)

اردو میں غلط املا لکھے جانے کی روایت اور دہلی کے سائن بورڈوں پر اس طرح کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین نے ایک کالم 'جامعہ سے ظامیا تک' لکھا ہے۔ اس میں بھی انہوں نے والد صاحب قبلہ والے واقعہ سے ملتا جلتا ایک چھوٹا سا قصہ بیان کیا ہے۔ اردو میں نام کے متبادل کے طور پر نہایت مہذب زبان میں اسم شریف کا استعمال بہت زیادہ نہیں لیکن کیا جاتا ہے۔ اردو کے قارئین کی کمی پر وہ کیا کہتے ہیں: آپ بھی سنئے:

'ہم نے مانا کہ اردو کے قارئین اب بھی بقید حیات ہیں لیکن ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن سے آپ 'اسم شریف' جاننے کی کوشش کریں تو پہلے تو آپ کا منھ تکنے لگ جاتے ہیں پھر اردو کے کسی بچے کھچے قاری سے خود اپنا 'اسم شریف' پوچھ بیٹھتے ہیں۔ بعد میں الٹا ہم سے شکایت کرتے ہیں کہ آپ نے سیدھے سیدھے نام کیوں نہیں پوچھا، اسم شریف کیوں پوچھا، حالانکہ یہ تو بڑا آسان سوال تھا۔ ایک بار ایک نوجوان کے حلیہ میں اپنے ایک دوست کی شباہت کو پا کر ہم نے اس سے پوچھا: میاں کیا تم ہمارے فلاں دوست کے فرزند دلبند ہو؟ بولا، لاحول ولا! میں کیوں ان کا فرزند دلبند ہونے چلا۔ میں تو ان کا بیٹا ہوں۔'

(مجتبیٰ حسین کے بہترین کالم، ص ۱۲۸)

رضا نقوی واہیؔ پر مجتبیٰ حسین نے ۱۹۸۰ء کے آس پاس خاکہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا 'رضا نقوی واہی: منظوم آدمی' چونکہ واہی صاحب ظریفانہ تحریر منظوم پیرائے میں لکھتے تھے۔ اسی مناسبت سے خاکہ نگار نے اپنے خاکہ کا عنوان منظوم آدمی رکھا۔ اس عنوان میں جوادیت اور معنویت پوشیدہ ہے۔ اس کی صراحت ضروری نہیں۔ نہایت عام فہم اور گفتگو کی زبان میں یہ خاکہ لکھا گیا ہے۔ واہی کا تعارف کراتے ہوئے مجتبیٰ حسین نہایت شستہ اور شگفتہ زبان میں واہی صاحب کے منظوم تبصرے پر اپنا تبصرہ کچھ یوں کرتے ہیں:

'ان سے ملئے۔ یہ ہیں رضا نقوی واہیؔ۔ اردو کے مشہور طنز و مزاحیہ شاعر۔ انہیں ذرا الٹ پلٹ کر غور سے دیکھئے۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان سے اسی وقت گھبرانا چاہئے جب ان کے ہاتھ میں قلم ہو۔ اس وقت تو یہ نہتے بیٹھے ہیں۔ آپ کو حساب تو آتا ہوگا۔ ان کی ذات میں سے قلم کو منہا کر دیا جائے تو جواب صفر آئے گا۔'

چند سطر کے بعد ایک راز کا افشاء یوں کرتے ہیں:

'آج ہم ایک راز کا افشاء بھی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جو ہم ان دنوں خاکہ نگاری کر رہے ہیں بلکہ خود واہی صاحب کا خاکہ لکھ رہے ہیں تو اس کی اصل وجہ واہی صاحب کا ایک منظوم خط ہے۔ بات یوں ہوئی کہ ۱۹۶۸ء میں جب ہم نے حکیم یوسف حسین خاں پر پہلا خاکہ لکھا تھا تو اس کی توصیف میں واہی صاحب نے ایک منظوم خط بھی لکھا تھا۔ جس کے کچھ اشعار آپ کو بھی سنائے دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں ہماری تعریف ہے۔'

یوسف حسین خاں کی تصویر کھینچ کر
تم نے نشاں بلند کیا اپنے آرٹ کا
ہنستے ہنساتے راز سبھی فاش کر دئے
کہتے ہیں اس کو خاکہ نگاری کا معجزا
اس درجہ خوش ہوا ہوں کہ در عالم خیال
کتنی ہی بار تم کو گلے سے لگا لیا
ذرا یہ تو بتاؤ سن کے یہ مضمون لاجواب
یوسف حسین خان کا ردِّ عمل تھا کیا

مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری کی خوبی یہ ہے کہ وہ خاکہ لکھتے لکھتے کچھ ایسی باتیں یا دلچسپ واقعات کچھ اس انداز سے لکھ دیتے ہیں کہ پڑھتے پڑھتے قاری قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ صاحب خاکہ کی نہ صرف شخصیت بلکہ اس شخصیت کی عادات و اطوار، طرزِ گفتگو، تکیہ کلام، اٹھنے بیٹھنے کے طور طریقوں، اس کے چہرے کی ساخت، اس کی بری عادتوں تک کو بیان کرنے سے احتراز نہیں کرتے ہیں۔ عمیق حنفی پر جو خاکہ لکھا ہوا خاکہ ہے، وہ طنز سے بھرپور اور ایک بہترین مزاحیہ تحریر ہے۔ حنفی صاحب کی خاصیت یہ تھی کہ وہ بہت مختصر مگر ملاقات کے قائل تھے۔ مجتبیٰ حسین نے ان کے مصافحے کے انداز پر جو طنزیہ بیان پیش کیا ہے، اسے ملاحظہ کیجئے۔ اس طنز کا انداز دیکھئے:

'تعارف کے بعد ان سے مصافحہ کرنا تو لکھا ہی تھا مگر انہوں نے مجھ سے کچھ اس طرح مصافحہ کیا جیسے بجلی کے تار کو چھونے جا رہے ہیں۔ ایک سکینڈ میں مصافحہ کے نام پر وہ مجھے چھو کر یوں چلے گئے جیسے واش بیسن میں انہیں اپنے ہاتھوں کو دھونے کی جلدی ہو۔ اپنی ان چھوٹی چھوٹی ٹانگوں کی مدد سے جو بڑی مشکل سے زمین تک پہنچ رہی تھیں، تیز تیز چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ یہ سب کچھ اس قدر آناً فاناً ہوا جیسا کہ عام طور پر بجلی کے شاک میں ہوتا ہے۔ میں بھونچکا سا رہ گیا۔

(خاکہ عمیق حنفی، مشمولہ مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں، ج ۲، ص ۱۳۵)

فیض احمد فیض پر مجتبیٰ حسین کا لکھا ہوا خاکہ بہت مقبول ہوا۔ جس وقت مجتبیٰ حسین این سی سی آرٹی میں ملازم تھے۔ انہیں دنوں فیض پر انہوں نے خاکہ لکھا۔ خاکے کو دلچسپ بنانے کے لئے انہوں نے پوری صلاحیت صرف کر دی۔ یہ خاکہ ایک خوبصورت انشائیے کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس میں ایک واقعہ کا ذکر ہے، پتہ نہیں کہ اس میں پوری صداقت ہے یا یوں ہی تفنن طبع یا زیب داستان کے لئے انہوں نے ایک لطیفہ شامل خاکہ کیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے مقبول عام خاکوں میں فیض احمد فیض کا خاکہ شمار کیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے یہ اقتباس:

'فیض سے دہلی میں میری کئی ملاقاتیں ہوئیں لیکن وہ اتنے کم آمیز اور کم گو تھے کہ ان ملاقاتوں میں جملوں کا تبادلہ بہت کم ہوتا تھا۔ ان کی ذات میں ایک عجیب سی نرمی، گھلاوٹ اور دھیما پن تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر دم ان کی ذات میں کلیاں چٹک رہی ہوں۔ بھلا کلیوں کے چٹکنے کی صدا کس نے سنی ہے۔ غالباً ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ فیض انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز کی دعوت پر ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ آزاد بھون میں ان کا جلسہ تھا۔ لوگ انہیں دیکھنے کے لئے امنڈ آئے تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو اردو نہیں جانتے تھے مگر فیض کو دیکھنے کی تمنا میں آئے تھے۔ یوں بھی فیض سننے سے زیادہ دیکھنے کی چیز تھے۔ میرے برابر میرے دفتر کے ساتھی اور تاریخ کے پروفیسر ارجن دیو اور تاریخ کی استاد مس اندرا سرینواس بیٹھے تھے۔ اندرا شرینواس کو اردو بالکل نہیں آتی تھی۔ وہ صرف فیض کو دیکھنے آئی تھیں۔ جب فیض نے کلام سنانا شروع کیا تو اندرا شرینواس نے مجھ سے کہا کہ میں فیض کے شعروں کا انگریزی میں ترجمہ کرتا چلا جاؤں۔ جیسے تیسے ایک غزل کے دو تین شعروں کا ترجمہ انہیں سنایا۔ کچھ ان کے پلے پڑا، کچھ نہیں پڑا۔ وہ میرے ترجمے پر جب جرح کرنے لگیں تو میں نے اندرا سے کہا کہ وہ باقی غزلوں کا ترجمہ ارجن دیو سے سنیں کیونکہ وہ فیض کی شاعری کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ اب ترجمہ کرنے کی ذمہ داری ارجن دیو نے سنبھال لی۔

جب فیض نے 'گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے' والی غزل سنانی شروع کی تو ایک لطیفہ ہو گیا۔ جب فیض نے یہ مصرع سنایا 'چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے' تو ارجن دیو نے کچھ رک اور سنبھل کر اندرا سے کہا:

Faiz says please come so that the business of garden may start.

اس پر اندرا نے سخت حیرت کے ساتھ مجھ سے پوچھا:

Mr. Mujtaba, what is business of garden I have never heard of such business before. Is it profitable business?

میں نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر اندرا سے کہا: 'اردو میں تو یہ بزنس آف گارڈن بہت زمانے سے چل رہا ہے۔ سراسر گھاٹے کا کاروبار ہے۔ پھر بھی آپ گلشن کا کاروبار چلانا چاہتی ہیں تو ارجن دیو سے فیض کے شعروں کا ترجمہ سنتی رہیں۔ آپ کو اس کاروبار کے اصول اور قاعدے معلوم ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس بزنس آف گارڈن کے چکر میں ارجن دیو نے بعد میں اندرا سرینواس کو فیض کی غزلوں کا کچھ ایسا بامحاورہ ترجمہ سنایا کہ خود ان دونوں کے بیچ گلشن کا کاروبار شروع ہو گیا۔ اب اندرا کو اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ گلشن کا کاروبار کیسے چلتا ہے کیونکہ اب وہ اندرا سرینواس سے اندرا ارجن سرینواس بن گئی ہیں۔ اپریل ۱۹۸۱ء میں فیض ہندوستان آئے تھے۔ میرے بچپن کے دوست علی باقر نے فیض سے کہا کہ وہ ایک رات ان کے گھر پر گزاریں۔ علی باقر کے ایک دوست نے کہا: فیض صاحب کو اس رات ہم جی بھر کر سنیں گے۔ اس رات علی باقر کے گھر دس بارہ احباب جمع تھے۔ رات کے پچھلے پہر تک محفل جمی رہی۔ دنیا جہان کی باتیں ہوئیں۔ سجاد ظہیر کا تذکرہ ہوتا رہا۔ میں نے فیض صاحب کو ارجن دیو اور اندرا سرینواس کے Business of Garden والا لطیفہ سنایا، بہت محظوظ ہوئے۔ پوچھا: یہ بتاؤ ان کے گلشن کے کاروبار میں انہیں کوئی پھل پھول ملا بھی یا نہیں؟ میں نے کہا، جی نہیں! فی الحال تو یہ گلشن کی آبیاری میں لگے ہوئے ہیں۔ بولے، ہمارے شعروں کی بنیاد پر گلشن کا کاروبار کریں گے تو یہی ہوگا۔ فیض سے وہ میری آخری ملاقات تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ان آنکھوں کو پھر فیض کا دیدار نصیب نہ ہوگا۔ وہ موہنی سی شخصیت پھر کہیں دکھائی نہیں دے گی۔'

(مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں، ج ۲، ص ۳۴)

مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں مزاح اور سنجیدگی کے روایتی فرق سے لاتعلقی کا بہت خاموش اظہار سب سے زیادہ ان کے شخصی خاکوں میں ہوا ہے۔ وہ مزاح اور سنجیدگی کے فرق سے نہ تو باضابطہ کرتے ہیں اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی طرح کی فلسفیانہ موشگافی سے کام لیتے ہیں مگر ان کا کوئی بھی خاکہ اٹھائیے، اسے پڑھتے پڑھتے آپ کہاں کس نقطے پر مزاح سے نکل کر سنجیدگی کے حدود میں داخل ہو گئے، اس کا احساس آپ کو اس وقت ہوتا ہے جب اچانک آپ کا اپنے ردِّعمل میں تبدیلی کی طرف دھیان جائے۔ مجتبیٰ حسین کے کئی خاکوں کو پڑھتے پڑھتے یا سنتے وقت مجھے اپنے احساسات میں ایک حرارت آمیز ابتری اور دھڑکنوں کی رفتار میں تیزی کا تجربہ ہوا ہے۔

مجتبیٰ حسین نے بے تحاشا کالم لکھے ہیں۔ ان کے یہ کالم بہت مقبول ہوئے اور ملک کے متعدد اردو اخبارات میں ڈائجسٹ بھی کئے گئے۔ آج بھی 'میرا کالم' کے عنوان سے ان کے پرانے کالم 'قند مکرر' کے طور پر نہایت پابندی کے ساتھ ہر پندرہ دن پر روزنامہ 'سیاست' حیدرآباد میں شائع ہوتے ہیں۔ روزنامہ 'سیاست' سے انہیں جذباتی وابستگی رہی ہے۔ وہ ہفتے میں تین چار بار کسی نہ کسی بہانے دفتر سیاست ضرور جاتے ہیں۔ کالم نگاری بھی کوئی آسان عمل نہیں ہے۔ اس کے لئے کالم نگار کو ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ کم وقت میں دلچسپ اور شگفتہ تحریر پیش کرنے کی اس پر ذمہ داری ہوتی ہے۔ ہندوستان کے مقابلے پاکستان میں کالم نگاری کی روایت زیادہ مستحکم رہی ہے اور آج بھی ہے۔ اردو میں ادبی کالم نگاروں کی بہت کمی ہے۔

تحلیل ہوئے بن کے دھواں، شہر میں ایسے
ہم پھر نہ گئے گاؤں، کبھی گھر نہیں دیکھا

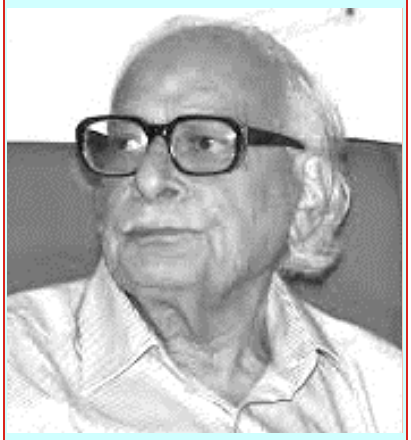

معروف ادیب، شاعر، نقاد اور صحافی **فضیل جعفری** بھی نہیں رہے۔ ان کا شمار اردو کے نمائندہ دانشوروں میں ہوتا تھا۔ ان کی غیر ادبی تحریریں بھی ادبی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ ادارہ 'نیا دور' جلد ہی فضیل جعفری کی **ادبی خدمات** پر ایک شمارہ معنون کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جس میں **اسرار گاندھی، علی احمد فاطمی** وغیرہ کے مضامین شامل رہیں گے

یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں کے اردو اخبار پرانے کالموں کو ڈائجسٹ کرتے رہتے ہیں۔

دہلی میں مجتبیٰ صاحب اسکوٹر پر شہر کا چکر لگاتے رہتے تھے۔ سنا ہے وہ اسی اسکوٹر سے شہر یار سے ملنے علی گڑھ تک چلے جاتے تھے۔ اپنے اسکوٹر پر بڑے بڑے ادیبوں اور آرٹسٹوں کو بٹھا کر دہلی کے مختلف مقامات کی سیر کرا چکے ہیں۔ اپنے کالم 'اپنے اسکوٹر کی یاد میں' انہوں نے ان متعدد شخصیات کا ذکر کیا ہے جنہوں نے ان کے اس اسکوٹر کو رونق بخشی۔ چنانچہ مشہور آرٹسٹ ایم ایف حسین اور مایۂ ناز فنکار صادقین کا ذکر اپنے کالم میں کچھ یوں کرتے ہیں:

'اگرچہ ملک کے مایۂ ناز آرٹسٹ ایم ایف حسین بھی ہمارے اسکوٹر کو رونق بخش چکے ہیں لیکن پاکستانی آرٹسٹ صادقین مرحوم کو ہمارا اسکوٹر کچھ اتنا پسند تھا کہ ٹیکسی لے کر ہمارے گھر آتے تھے اور ہمارے اسکوٹر پر بیٹھ کر دہلی کی سیر کو نکلتے تھے۔ واپسی میں ہمیں اور ہمارے اسکوٹر کو گھر چھوڑ کر پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے ٹھکانے پر روانہ ہو جاتے تھے۔ جتنی دیر پیچھے بیٹھتے تھے اتنی دیر تک اپنی انگشت شہادت کی مدد سے ہماری پیٹھ پر یا تو کوئی خیالی تصویر بنایا کرتے تھے یا آیات قرآنی کی خطاطی فرماتے تھے۔ گرمی کے دنوں میں ایک

ساقی فاروقی

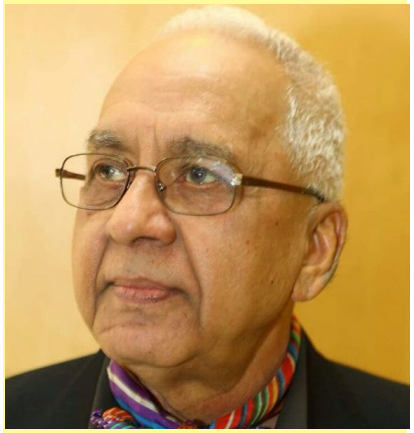

'پاپ بیتی' ہو یا ان کی دوسری تخلیقات، ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ ساقی فاروقی کچھ لکھیں اور عالمی پیمانے پر سرخیوں میں نہ آئیں۔ ساقی فاروقی کی ۸۲ ویں سالگرہ کے موقع پر دسمبر ۲۰۱۸ء کا 'نیا دور' ساقی فاروقی پر مبنی ہوگا جس میں **بیدار بخت، اسد محمد خان، مشرف عالم ذوقی، زمرد مغل** وغیرہ کے مضامین شامل ہوں گے۔

رات پاکستانی گلوکار غلام علی ہمارے اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ شدید حبس کا عالم تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس حبس سے بچنے کے لئے ہم یوں ہی اسکوٹر چلاتے رہیں لیکن مشکل یہ تھی وہ پیچھے بیٹھے بیٹھے کوئی نہ کوئی راگ الاپنا شروع کر دیتے تھے۔ نتیجہ میں ہمیں آگے بیٹھے بیٹھے پیچھے الٹی داد بھی دینی پڑتی تھی۔ بیشتر اردو شاعروں کو اپنے اسکوٹر پر بٹھانے کی وجہ سے ہمیں اس طرح کے پوز میں داد دینے کی خاصی مہارت ہوگئی تھی۔ اب کیسے بتائیں کہ اس اسکوٹر سے ہماری کتنی ہی قیمتی اور خوبصورت یادیں وابستہ ہیں۔ ہم ان نامور خواتین کے نام یہاں نہیں لکھنا چاہتے جنہوں نے ہمارے اسکوٹر کی پچھلی سیٹ کو رونق بخشی ہے کیونکہ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔ (ایک تو ہماری اہلیہ محترمہ ہیں۔)'

(مجتبیٰ حسین کے بہترین کالم، ص ۱۳۵)

اسکوٹر کوئی ایسی شئے نہیں جس کی زیادہ اہمیت ہو لیکن اس معمولی سی چیز کو عنوان بنا کر جو کالم مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے وہ ان کی استادی اور ہنرمندی کی دلیل ہے۔ وہ اپنے خاکوں، کالموں، انشائیوں اور سفرناموں میں بڑی بڑی شخصیات کا ذکر اکثر و بیشتر کرتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ

'دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں'

❑❑❑

اودھ نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'اودھ نمبر' بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

آپ کے خطوط

'نیا دور' کا اگست ماہ کا شمارہ مرحوم سابقہ وزیر اعظم اٹل بہاری جی واجپئی کی نہایت خوبصورت تصویر والے سرورق اور تمام معیاری مشمولات سے آراستہ و پیراستہ دستیاب ہوا ہے۔

اس بار کے اداریے میں اس شمارے کے تحت متعدد غیر مسلم ادبا کی تخلیقات کی شمولیت ادارے کے قومی یکجہتی و یکسانیت کے جذبے کی جس طرح سے خط کشی کی گئی ہے، وہ سبھی جرائد کے لیے قابلِ تقلید ٹھہرتا ہے۔مستزاد ، یہ مضامین غیر مسلم ادباء کی 'سارے زمانے میں دھوم مچانے والی' اردو زبان کی خدمات کو بخوبی نشانزد کرتے ہیں۔اس میں دو آرا قطعی نہیں ہے کہ جریدہ کا معیار دنوں دِن بلند سے بلند تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔بقول لے

''اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ!!''

واجپئی صاحب کی کویتاؤں سے انکے شاعری کی بلندگی نمایاں ہوتی ہے اور ان سے وابستہ مضامین مختصر ہونے کے باوصف انہیں ایک مناسب و موزوں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور تا حال دیگر شائع ہو چکے مضامین سے کافی سبقت لے جاتے ہیں۔

اس خاکسار نے اپنے مضمون میں صفحہ 48 پر جناب منور رانا کے محولہ شعر کے فراموش ہو چکے اول مصرعے کو از حد محنت سے تلاش کر لیا ہے اور وہ یہ ہے:

'میاں میں شیر ہوں اور شیروں کی غراہٹ نہیں جاتی'

شہرہ آفاق افسانہ نگار دیپک بدکی صاحب کے احسن افسانے 'تہذیب کا تسلط' میں از حد مہذب طریقہ سے عورت ذات کی آزادی و مرد کے مساوی حقوق کی حصولیابی کے لیے ایک ایماندار کوشش نظر آتی ہے۔یہی اس افسانے کا اہم جمع نقطہ ہے۔ہیروئن کرسوئی کے غیر مذہبی ہونے باوصف اس کے منہ سے تفنن طبع،لواطت، تضحیک وغیرہ اصل عربی فارسی اور اردو کے الفاظ بلوانا اور خالص ہندی کی لفظیات کا تصرف غیر قدرتی و غیر متوقع ہے اور فی الحال متنازع فیہ کہا جا سکتا ہے۔

گزشتہ سال پنجاب سرکار کے 'شرومنی اردو ادیب' کے اعزاز سے نوازی گئی افسانہ نگارہ ڈاکٹر رینو بہل کے افسانے 'لاگی چھوٹے نا' میں غیر مساوی عمروں کے عورت و مرد کے مابین رشتوں سے وابستہ مختلف مسئلوں کو پیش کیا جا سکا ہے۔اس میں راجن پاٹھک اور اس سے عمر میں بیس سال چھوٹی حسین بیوی کا اپنے سے کم عمر والے ہیرو رجت کے ساتھ عشق فرمانے کی داستان ایسے زندہ جاوید کرداروں کو ہمارے رو برو ایستادہ کرتی ہے کہ تمام تر واقعات نہایئت قدرتی اور حقیقی رنگوں میں مرتسم اعلان کیے جاینگے۔اعلیٰ کردار نگاری اس افسانے کا بھی ایک اہم جمع نقطہ (پلس Plus) پوائنٹ Point گردانا جاے گا۔

جناب اویناش امن کے افسانے 'جاگتی آنکھوں کا سراب' میں دورِ عصر میں کم عمر والی لڑکیوں کے ساتھ زنا بالجبر کرنے کی روز بروز افزوں ہونے والی واردات سے یہ ایک غلط اثر ہوا ہے کہ افسانے کا صالح ہیرو سراب بھی اپنی مرحومہ بیٹی ثنا کے فوت ہونے کے بعد اسی کی ہم شکل پارول کے ساتھ معاشرے میں ایک پاک رشتہ رکھنے میں بھی قاصر ہی رہتا ہے۔وہ جس پارول کی صورت میں اپنی مرحومہ دختر کو پانے کا اعادہ کر کے مستفیض ہو سکتا تھا، اس میں کا ملاًنا کام ہی رہتا ہے اور اسکا ایک پاک عزم بھی بقول افسانے کے عنوان کے 'جاگتی آنکھوں کا سراب' ہی ثابت ہو کر رہ جاتا ہے۔

راجیو پرکاش ساحر صاحب کا افسانہ 'حوادث غایبانہ'

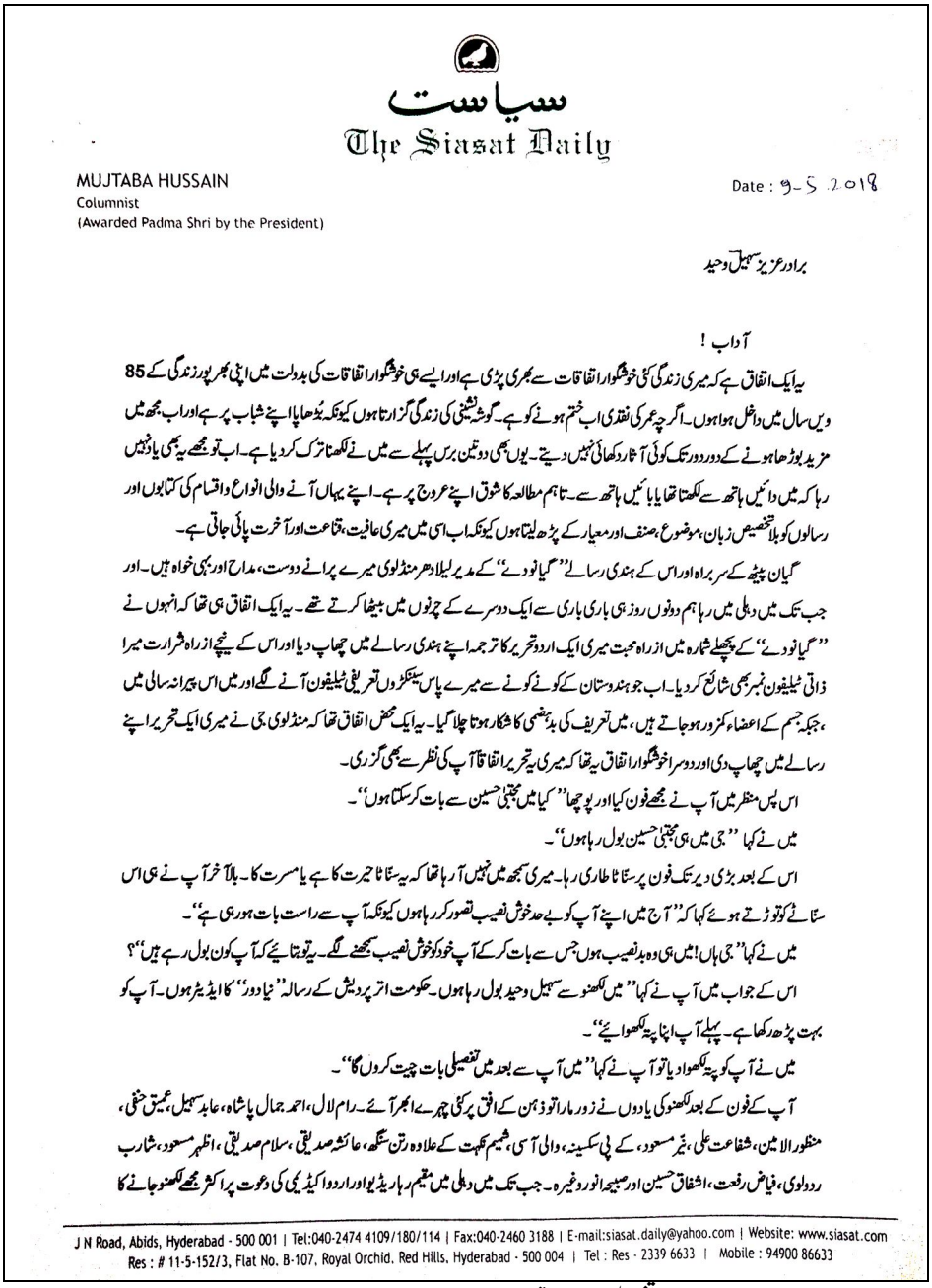

سیاست
The Siasat Daily

MUJTABA HUSSAIN
Columnist
(Awarded Padma Shri by the President)

Date : 9-5-2018

برادر عزیز سہیل وحید

آداب !

یہ ایک اتفاق ہے کہ میری زندگی کئی خوشگوار اتفاقات سے بھری پڑی ہے اور ایسے ہی خوشگوار اتفاقات کی بدولت میں اپنی بھرپور زندگی کے 85 ویں سال میں داخل ہوا ہوں۔اگرچہ عمر کی نقدی اب ختم ہونے کو ہے۔گوشہ نشینی کی زندگی گزارتا ہوں کیونکہ بُڑھاپا اپنے شباب پر ہے اور اب مجھ میں مزید بوڑھا ہونے کے دور دور تک کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔یوں بھی دو تین برس پہلے سے میں نے لکھنا ترک کر دیا ہے۔اب تو مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا یا بائیں ہاتھ سے۔تاہم مطالعہ کا شوق اپنے عروج پر ہے۔اپنے یہاں آنے والی انواع واقسام کی کتابوں اور رسالوں کو بلا تخصیص زبان، موضوع، صنف اور معیار کے پڑھ لیتا ہوں کیونکہ اب اسی میں میری عافیت، قناعت اور آخرت پائی جاتی ہے۔

گیان پیٹھ کے سربراہ اور اس کے ہندی رسالے ''گیانودے'' کے مدیر لیلادھر منڈلوی میرے پرانے دوست، مداح اور بہی خواہ ہیں۔اور جب تک میں دہلی میں رہا ہم دونوں روز ہی باری باری سے ایک دوسرے کے چرنوں میں بیٹھا کرتے تھے۔یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ انہوں نے ''گیانودے'' کے پچھلے شمارہ میں ازراہ محبت میری ایک اردو تحریر کا ترجمہ اپنے ہندی رسالے میں چھاپ دیا اور اس کے نیچے ازراہ شرارت میرا ذاتی ٹیلیفون نمبر بھی شائع کر دیا۔اب جو ہندوستان کے کونے کونے سے میرے پاس سینکڑوں تعریفی ٹیلیفون آنے لگے اور میں اس پیرانہ سالی میں، جبکہ جسم کے اعضاء کمزور ہو جاتے ہیں، میں تعریف کی بدہضمی کا شکار ہوتا چلا گیا۔یہ ایک محض اتفاق تھا کہ منڈلوی جی نے میری ایک تحریر اپنے رسالے میں چھاپ دی اور دوسرا خوشگوار اتفاق یہ تھا کہ میری یہ تحریر اتفاقاً آپ کی نظر سے بھی گزری۔

اس پس منظر میں آپ نے مجھے فون کیا اور پوچھا ''کیا میں مجتبیٰ حسین سے بات کر سکتا ہوں''۔

میں نے کہا ''جی میں ہی مجتبیٰ حسین بول رہا ہوں''۔

اس کے بعد بڑی دیر تک فون پر سناٹا طاری رہا۔میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سناٹا حیرت کا ہے یا مسرت کا۔بالآخر آپ نے ہی اس سناٹے کو توڑتے ہوئے کہا کہ ''آج میں اپنے آپ کو بے حد خوش نصیب تصور کر رہا ہوں کیونکہ آپ سے راست بات ہو رہی ہے''۔

میں نے کہا ''جی ہاں! میں ہی وہ بدنصیب ہوں جس سے بات کر کے آپ خود کو خوش نصیب سمجھنے لگے۔یہ تو بتائیے کہ آپ کون بول رہے ہیں''؟

اس کے جواب میں آپ نے کہا ''میں لکھنو سے سہیل وحید بول رہا ہوں۔حکومت اتر پردیش کے رسالہ ''نیا دور'' کا ایڈیٹر ہوں۔آپ کو بہت پڑھ رکھا ہے۔پہلے آپ اپنا پتہ لکھوائیے''۔

میں نے آپ کو پتہ لکھوا دیا تو آپ نے کہا ''میں آپ سے بعد میں تفصیلی بات چیت کروں گا''۔

آپ کے فون کے بعد لکھنو کی یادوں نے زور مارا تو ذہن کے افق پر کئی چہرے ابھر آئے۔رام لال، احمد جمال پاشاہ، عابد سہیل، عمیق حنفی، منظور الامین، شفاعت علی، نیّر مسعود، کے پی سکسینہ، والی آسی، شمیم نکہت کے علاوہ رتن سنگھ، عائشہ صدیقی، سلام صدیقی، اظہر مسعود، شارب ردولوی، فیاض رفعت، اشفاق حسین اور صبیحہ انور وغیرہ۔جب تک میں دہلی میں مقیم رہا ریڈیو اور اردو اکیڈیمی کی دعوت پر اکثر مجھے لکھنو جانے کا

J N Road, Abids, Hyderabad - 500 001 | Tel:040-2474 4109/180/114 | Fax:040-2460 3188 | E-mail:siasat.daily@yahoo.com | Website: www.siasat.com
Res : # 11-5-152/3, Flat No. B-107, Royal Orchid, Red Hills, Hyderabad - 500 004 | Tel : Res - 2339 6633 | Mobile : 94900 86633

اول تا آخر استعاراتی زبان وفنتاسی کی ہیئت میں تحریر کردہ تخلیق زیادہ ہے اور افسانہ کم۔ اس میں ہر چند افسانے کے فنی محاسن کا کافی فقدان ہے، تاہم بیانیہ اسلوب قاری کو ضرور باندھے رکھتا ہے۔ اس افسانے کی اشاعت میں متعدد اغلاط چلے گئے ہیں اور آگے سے معیار کو ارفع و اعلیٰ کرنے کے نصب العین سے پروف ریڈنگ میں مطلوب تدارک درکار ہے۔ یہ ناچیز مثلاً پہلے غلط املا و زبان کی مثال دے کرساتھ ہی قوسین کے مابین صحیح الفاظ دینے کی جسارت کررہا ہے۔

اردو، ہندی و پنجابی زبانوں میں بہ یک وقت یدطولیٰ رکھنے والے ادیب و ناقد ڈاکٹر نریش کے متنوع مضمون 'تصوف کے تناظر میں' ہندوستانی روحانیت' میں متوسطین ہندو بھگتی کے مختلف بوقلموں پہلوؤں کے ساتھ موازنہ قابلِ دید وداد ہے۔ انکے عمیق و دقیق مطالعے کا گرویدہ ہوجانا پڑتا ہے۔ فقط ہندو صحیفہ 'گیتا' کا صحیح نام''شریمد بھگود گیتا' بمعنی 'شریمان بھگوان کی گائی ہوئی گیتا' ہی درج کرنا درکار تھا، نہ کہ 'شریمد بھاگوت گیتا'۔

کرشن بھاؤک

پٹیالہ (پنجاب)

آپ کی ادارت میں نیا دور اپنے شاندار گٹ اپ اور معیاری تخلیقات سے مزین قارئین کو مسحور کررہا ہے۔ باز دید، ہندوستانی ادب، غیر ملکی ادب، ہندی کہانی وغیرہ کالموں نے اس رسالے کو ادبی رسالوں میں ایک منفرد مقام بخشا ہے اور یہ سب آپ کے اعلیٰ ادبی ذوق اور بلند نگاہی کا غماز ہے۔ نیا دور اپنے خاص نمبروں کے لئے مشہور رہا ہے۔ لیکن آپ نے عام نمبروں کو بھی معروف قلمکاروں کے گوشوں سے مزین کر کے اس کے وقار میں اضافہ کردیا ہے۔ تخلیق کاروں کی تصویروں سے سجی مشمولات کی فہرست بہت خوب ہے۔

جون، جولائی اور اگست کے شمارے پیش نظر ہیں۔ جون کے شمارے میں سلمان علی خان کا مضمون 'نیا دور کے پیشرو اخبار اور جرائد' اور خورشید حیات کی کہانی 'سورج ابھی جاگ رہا ہے' پسند آئے۔

جولائی کے شمارے میں مشہور ادبی شخصیت انور جلال پوری کی شخصیت وفن پر مشتمل سبھی مضامین اچھے ہیں۔ انور جلال پوری کی تہدار اور طرحدار شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی قابلِ تحسین کوشش کی گئی ہے۔

کہانیوں میں پرل ایس بک کی انگریزی کہانی 'دوسری زندگی' اور چھما شرما کی ہندی کہانی 'اس کے سورج چاند ستارے' خاص طور پر پسند آئیں۔

آپ نے اگست کے شمارے کو غیر مسلم تخلیق کاروں کی تخلیقات سے مزین کیا ہے۔ یہ ایک قابل تحسین قدم ہے۔ اسکی جتنی بھی سراہنا کی جائے کم ہے۔ اس سے اردو ادب کی ترویج میں غیر مسلم قلمکاروں کی خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔ پی۔ پی۔ شری واستوا رند، رتن سنگھ، دیپک بدکی، رینو بہل، راجیو پرکاش ساحر وغیرہ کی تخلیقات کو اردو ادب کا قابل قدر حصہ کہا جاسکتا ہے۔ اٹل بہاری واجپئی کی کویتاؤں نے رسالے کی اہمیت وافادیت بڑھادی ہے۔

انور ادیب

آسنسول (مغربی بنگال)

سیاست

The Siasat Daily

MUJTABA HUSSAIN
Columnist
(Awarded Padma Shri by the President)

Date :

موقع ملا۔ غالباً دس سال پہلے آخری بار مجھے پریم چند تقاریب میں شرکت کیلئے لکھنو جانے کا موقع ملا۔ ایک زمانہ میں ''نیا دور'' میرے پاس بڑی پابندی سے آیا کرتا تھا۔ تاہم 2007ء کے بعد جب میں نے دہلی کو خیر باد کہہ کر حیدر آباد میں بودوباش اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تو اس افراتفری میں ''نیا دور'' سے میرا ربط ضبط ٹوٹ گیا۔ بہرحال آپ سے ٹیلیفونی بات چیت کے چار پانچ دن بعد لکھنو سے آپ کا بھیجا ہوا بھاری پارسل ملا، جس میں سے ''نیا دور'' کے دس بارہ شمارے اچانک نکل آئے تو ان شماروں کی چکاچوند سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ ایک جہانِ رنگ و نور تھا جو اچانک ہویدا ہوگیا۔ ایک دبستانِ علم وادب اور تہذیب وثقافت تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے کھل گیا۔ میری حالت 'اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے' والی ہوگئی تھی۔ ایک ایک شمارہ کو دیکھتا تھا تو دل بلّیوں اچھلنے لگ جاتا تھا۔ قدرت نے آپ کو خداداد صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ میری دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔ خدا آپ کو نظر بد سے بچائے۔ (اردو میں آپ جیسے ذہین لوگوں کیلئے میں بطور خاص یہ دعا کرتا ہوں کیونکہ بدقسمتی سے اردو معاشرہ میں 'نظر بد' وافر مقدار میں پائی جاتی ہے)۔ آپ کی سلیقہ مندی، نکتہ آفرینی، دوربینی، خوش ذوقی، خوش نظری، اور اعلیٰ ظرفی نہ صرف لائق صد تحسین ہے بلکہ قابل رشک بھی ہے۔

یقین مانیئے آپ کا ''نیا دور'' ہمارے معاشرہ کے نئے دور سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ یقین نہیں آتا کہ یہ اردو کا رسالہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو عصری اشاعتی ٹکنالوجی سے بھرپور استفادہ کرنے کا ہنر آتا ہے۔

عمر کے آخری حصہ میں آپ سے یہ جو اچانک تعلق خاطر پیدا ہوا ہے وہ یقیناً خوشگوار اتفاق ہے۔ خدا آپ کو تادیر سلامت اور خوش وخرم رکھیں۔ آمین

دعا گو

مجتبیٰ حسین

To
Mr. Sohail Waheed
Editor
Naya Daur, Monthly
Department of information
& Public Relations, Park Road,
Lucknow-226001
(Uttar Pradesh)
Ph: 09415007694

J N Road, Abids, Hyderabad - 500 001 | Tel:040-2474 4109/180/114 | Fax:040-2460 3188 | E-mail:siasat.daily@yahoo.com | Website: www.siasat.com
Res : # 11-5-152/3, Flat No. B-107, Royal Orchid, Red Hills, Hyderabad - 500 004 | Tel : Res - 2339 6633 | Mobile : 94900 86633

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک نے ۹ ستمبر ۲۰۱۸ء کو راج بھون میں آنجہانی سابق وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی جی کی ادبی خدمات پر مرکوز ماہنامہ 'نیا دور' کے خصوصی شمارے (اگست ۲۰۱۸ء) کا اجراء کیا
پرتُل جوشی، پرویز ملک زادہ، ایڈیٹر 'نیا دور' سہیل وحید (دائیں) ڈائرکٹر انفارمیشن ڈاکٹر اَبُو ل کمار، رفعت نعیم صفوی، سلیم احمد، وقار حسین رضوی، طارق قمر (بائیں)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی لکھنؤ میں سابق وزیر اعلیٰ پنڈت گووند ولبھ پنت
کی ۱۳۱ ویں جینتی کے موقع پر گلہائے عقیدت پیش کرتے ہوئے۔ ساتھ میں ہیں گورنر جناب رام نائک (۱۰ ستمبر ۲۰۱۸ء)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی، سی ایم ایس، گومتی نگر وستار، لکھنؤ میں 'دیوی اوارڈس' یافتہ خواتین کے ساتھ (۱۴ ستمبر ۲۰۱۸ء)

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

ہندوستان کے وزیر اعظم جناب نریندر مودی وارانسی میں مختلف ترقیاتی پروجیکٹس کا آغاز کرتے ہوئے۔
ساتھ میں ہیں اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی (۱۸؍ستمبر ۲۰۱۸ء)

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی اور نائب وزیر اعلیٰ ڈاکٹر دنیش شرما
لکھنؤ میں 'یوم اساتذہ' کے موقع پر ریاستی اساتذہ کی اعزازی تقریب میں اساتذہ کے ساتھ (۵؍ستمبر ۲۰۱۸ء)

نیا دور کے شمارے اب A.H. Wheeler لکھنؤ کے سبھی بک اسٹالوں پر بھی دستیاب ہیں

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

वर्ष : 73 अंक 04
सितम्बर 2018
मूल्य : 15 रु. / –
वार्षिक मूल्य : 165 रु. / –

पंजीयन संख्या : 4552 / 51
एल0 डब्लू / एन0 पी0 / 101 / 2006–08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, MkW mTToy d[ekj] निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ–226001 से प्रकाशित–सम्पादक, **सुहेल वहीद**